صاحب اور مذہب

مترجمہ

عبداللہ بٹ

(بی، اے (آنرز))

مکتبہ اردو لاہور

طبع اول قیمت آٹھ آنے

گیلانی پریس لاہور میں باہتمام چودھری نذیر احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر مکتبہ اُردو لاہور سے شائع ہوئی

پیش لفظ

لیونارڈ ام شفٹ کی کتاب "ہندوستان کی موجودہ حالت" کے دو ابواب کو "راجہ اور کسان" کے نام سے اردو کا جامہ پہنانے کے بعد اب اس کے مزید دو ابواب "صاحب اور مذہب" کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں۔ یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ "بابو اور مزدور" مزید دو ابواب بھی جلد ہی اردو میں منتقل کر دیئے جائیں گے۔

مترجم کے لئے ضروری نہیں کہ مصنف کے تمام خیالات سے متفق ہو۔ میرے نزدیک مذہب برائیوں کی جڑ نہیں۔ بلکہ ان برائیوں کی روک تھام اور سوسائٹی کی صحیح تعمیر کا باعث ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مذہب کی آڑ میں غریبوں کی لوٹ کھسوٹ جاری رہی ہے۔ لیکن یہ اس وقت تک ہے۔ جب تک عوام میں بیداری نہیں جب ہمارے عوام میں اپنے نفع و نقصان سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی۔ تو ہماری سوسائٹی کی تمام مصیبتیں اور مشکلات رفع ہو جائیں گی۔ اور مذہب محبت، امن، اتحاد اور ترقی

کا سب سے بڑا ذریعہ ثابت ہوگا۔

مجھے امید ہے یہ کتاب مسائل زندگی کا قریب سے مطالعہ کرنے میں کافی مدد دے گی۔

۱۳۔ برانڈرتھ روڈ
لاہور

عبداللہ بٹ
جنوری ۱۹۴۳ء

صاحب

(۱)

جب تک ہم لوگوں کے اخلاق بلند کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہمارا ان کو محض جائز قوانین اور مناسب ٹیکس کے فوائد عنایت کرنا کافی نہیں ہے۔ ایک بیرونی حکومت کے زیر اثر اس کے دباؤ کے اتنے اسباب ہوتے ہیں جو اس کو ڈوبنے سے نہیں بچا سکتے۔ مشہور مقولہ ہے، وہ جو اپنی آزادی سے محروم ہو جاتا ہے اپنا آدھا جوہر کھو بیٹھتا ہے۔ اور یہ مقولہ افراد و اقوام پر یکساں حاوی ہے۔ جائداد نہ رکھنا ہرگز اتنی ذلت کا باعث نہیں۔ جتنا ایسی جائداد کا مالک ہونا جو ایک بیرونی حکومت کے اختیار میں ہو اور جس میں ہمارا کوئی حصہ نہ ہو۔ غلام قوم قومی حقوق اسی طرح کھو بیٹھتی ہے جس طرح غلام انسان ایک آزاد انسان کے حقوق سے محروم ہو جاتا ہے۔ غلام قوم اپنے آپ پر ٹیکس لگانے، اپنے لئے خود قوانین وضع کرنے اور ان پر عمل درآمد کرانے اور ملک کے اندرونی انتظام میں حصہ رکھنے کا حق کھو بیٹھتی ہے

اور پھر قومی کردار کو تباہ کرنے اور قومی روح کو کچلنے کے لئے یہ کسی ملکی فرمانروا کی آمرانہ قوت نہیں بلکہ ایک بیرونی طاقت ہے۔ یہ زیادہ پسندیدہ ہو کہ ہم ملک سے بالکل بے دخل کر دیئے جائیں بہ نسبت اسکے کہ ہمارا نظامِ حکومت ساری قوم کی تذلیل کا باعث ہو۔"

یادداشت تحریر سر ٹامس منرو
۳۱ دسمبر ۱۸۲۴ء

سر ٹامس منرو کے یہ الفاظ ہر انگریز کے اعلیٰ رجحانات کو اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں۔ اور صرف ایک یہی مثال نہیں ہے۔ ہندوستان کو برطانیہ کے معیار پر لے آنا ایام گذشتہ میں نادر نہ تھا۔ سول سروس کے لوگ اپنے لئے نئی راہ نکالنے اور انتظامی امور پر تنقید کرنے سے جھجکتے نہیں تھے۔ ۱۸۳۰ء میں دریائے سندھ میں جہاز رانی کی تجویز پیش ہوئی۔ تو سر چارلس مٹکاف نے ان زوردار الفاظ میں اس کی مذمت کی:۔

"اپنے ہمسائیوں کے علاقے اور دریاؤں کو ان کی مرضی کے بغیر فریب یا جبر سے پیمائش کر کے انہیں ڈرانا اور پریشان کرنا اوباشی نہیں تو کیا ہے؟ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو تحفہ بھیجنے کے بہانے دریائے سندھ کی پیمائش کی سکیم حد درجہ قابلِ اعتراض ہے میری رائے میں یہ ایک ایسا مکر ہے جو ہماری حکومت کے شایاں نہیں اور جسکا انکشاف ان طاقتوں کے حسد و غصہ کو بھڑکانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ جن کو ہم دھوکا دیتے ہیں۔"

اگرچہ مٹکاف کا خیال غالب نہ آیا۔ لیکن یہ حقیقت کہ ایک ماتحت حیثیت سے اسے حاکم اعلیٰ کی طرف سے پیش کردہ تجویز پر تنقید کرنے کی مجال ہوئی، ثابت کرتا ہے کہ آج کی نسبت پہلے رائے کی

یکسانیت و ربط میں اختلال تھا۔ اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ رعیت پسندانہ پالیسی پر عمل کیا جاتا تھا۔ لیکن افراد ہمیشہ اس کی تنقید میں بے باک رہے ہے۔ سر فریڈرک ہالیڈے نے استغاثی اور عدالتی فرائض ایک ہی منصب میں جمع کر دینے پر جس سے حق و انصاف کا خون ہوتا ہو، سخت نکتہ چینی کی ہے۔

"اس کی موجودگی ہمارے فوجداری محکمہ ہائے عدالت پر عوام کے اعتماد میں نقصان کا باعث ہو گی۔ اور خود دادرسی کے اختیار کا بھی ناجائز استعمال لازمی امر ہے"

مسٹر لُوِل چند نے فروری ۱۹۳۸ء میں ماڈرن ریویو کے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اُس زمانے کے انتظامیہ مباحث میں احساس ذمہ داری تھا اور ان میں پارلیمنٹری رنگ پایا جاتا تھا۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ افسرانِ حکومت نے حکومت پر تنقید اور اعتراض کرنے سے اپنی ترقی اور سرافرازی میں کوئی نقصان نہ اٹھایا۔ حکومت کی رپورٹیں اور تحریریں بہ ظاہر نہیں کرتیں کہ یہ لوگ ایک ہی سانچہ میں ڈھلے ہوتے تھے بلکہ" وہ زندہ ضمیروں کا زندہ اظہار رہے۔ اور ان میں سے ہر ایک مخصوص خیالات و جذبات اور ہمدردیوں کا حامل رہے" ۱۸۵۴ء میں مدراس کی "کمیشن تحقیق تعذیب" نے اپنی رپورٹ میں اختصاراً بیان کیا کہ "ہندوستانیوں پر برطانی عملداری کے موجودہ نظام کا ذہنی اثر یہ ہے کہ وہ شکایات کو بے فائدہ خیال کرتے ہیں"۔

اب ایسی صاف گوئی نادر ہے۔ ابھی ابھی اس کی ایک تازہ مثال کیرو کے مقدمہ میں دیکھنے میں آئی ہے۔ جبکہ چیف جج نے ایک ایسے ملزم کو بری کر دیا جس نے پولیس کے ایک آدمی کو اس بنا پر قتل کیا تھا کہ مقتول نے اسے حد درجہ اذیت دی تھی۔ اور ملزم نے صرف مدافعانہ کارروائی کی تھی۔

میں اپنے آپ کو یہاں صرف ملازمتوں تک محدود رکھتا ہوں اور اس صریح غارتگری کی ابتدائی تاریخ سے بحث نہیں کرتا۔ جو ہندوستان پر مارکس کے خطوط اور ہیجیسن کی مملکت نواباں' میں قابل مطالعہ ہے۔ برطانوی عملداری کے ایام اولین میں اس بے پناہ غارتگری کی حقیقت کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے۔ جو اس سرمایہ کی فراہمی میں ممد ہوئی جس نے برطانیہ کا متوسط طبقہ پیدا کیا اور انگلستان کو صنعتی ملک میں تبدیل کر دیا اور آنے والے دور کا پیش خیمہ بنی۔ جبکہ انگلستان نے ہندوستان میں سوتی مال کا سیلاب بہا دیا۔ اور ہندوستانی دستکاری تباہ و برباد کر دی گئی۔

لیکن انیسویں صدی کے نصف میں برطانیہ کے نظم و نسق کی ترکیب و ساخت میں ایک افسوسناک انقلاب رونما ہوا۔ اپنی ہیئت میں کم و بیش آزاد اور حتی الامکان اپنی اغراض کو رعایا کی اغراض سے یکجا کرنے کے اہل ہوتے ہوئے یہ صریحاً بیرونی حکومت بن گئی۔ روح کی یہ تبدیلی ابتدائی آزادیٔ فکر کے اخراج کے مترادف تھی۔ حکومت پارٹی نواز، خود غرض اور ہندوستانیوں کی خواہشات کی دشمن ہو گئی۔ اسی وقت 'کالے افسروں' کی تصویر منظر عام پر آنی شروع ہوئی۔

کارنوالس اس سلسلہ کا جدّ امجد تھا۔ نئی جاگیردار جماعت پیدا کرنے کے علاوہ اس نے دیدہ و دانستہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ ملازمتوں سے برطرف کرتے ہوئے ایک نیا حکمران طبقہ پیدا کیا۔ وہ لکھتا ہے "میرا پختہ یقین ہے کہ ہر ہندوستانی فاسق و فاجر ہے"[1]۔ کارنوالس لارڈ مارلے کا پیشرو معلوم ہوتا ہے جس کو اعلیٰ ذمہ دار عہدوں پر فائز ہندوستانیوں

---

[1] مگر منرو لکھتا ہے کہ ہندوستانی سادہ، معصوم اور ایماندار ہیں۔ اور ان میں سچائی کے اسی قدر عناصر موجود ہیں۔ جتنے دنیا کے کسی گروہ میں ہو سکتے ہیں۔

سے نفرت تھی۔

لیکن کارنوالس ان انگریزی افسروں کی بداطواری پر چشم نمائی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جن پر اس کو پوشیدہ تجارت میں شغل تمام رکھنے کا شبہ تھا۔ اس خرابی کا علاج اس نے زیادہ تنخواہ و ترقی کی جاذبیت میں تلاش کیا۔ لیکن ہندوستانی طبقوں پر یہ دروازہ بند کر دیا۔ جیسا کہ دیکھنے میں آئیگا ملک کے متعلق اسکی معلومات سابقہ حکّام کے برعکس نہایت محدود تھیں۔ اور باشندوں کے کیریکٹر میں اس کی نظر بالکل سطحی تھی۔ ذہنی ہمدردی نہ ہونے کی وجہ سے لاعلمی بڑھتی گئی۔ اور اگرچہ اس کی زندگی میں نمائشی ٹھاٹھ نہ تھا۔ کارنوالس نے اس تنہائی اور لوگوں سے عدم تعلق کو زیادہ کرنا شروع کر دیا جو بعد میں اس حد تک پہنچا کہ "ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کارنوالس بھول چکا ہے کہ مغرب سے متعارف ہونے سے صدیوں پیشتر یہاں بھی قانون و انصاف کا دور دورہ تھا۔ اور انہی باشندوں کی سماجی زندگی کا توازن قائم و برقرار تھا۔ اور وہ وقت تھا کہ جب ہندوستان آباد و معمور اور اسکے اہالی شادکام و بامراد تھے"۔ انگریزوں کی بلند اخلاقی اور ہندوستانیوں کے عامیانہ بازاری پن میں یہ یقین واثق ابھی تک کافی انگریزوں میں موجود ہے اور اس کی تازہ ترین مثال ایک فوجی افسر کی تھی۔ جس نے مجھے یقین دلایا کہ ہندوستانی جبلی طور پر بددیانت ہونے کی وجہ سے کبھی بھی حکومت نہیں کر سکتے۔

سر جان شور تنگ خیالی میں کارنوالس سے بھی دو قدم آگے تھا اور اس کے ایک ہمعصر کا بیان ہے کہ وہ اہلِ ہند کے خلاف تعصّب کلی رکھتا تھا۔ لیکن وہ شخص ان بےشمار صفات کا حامل سمجھا جاتا تھا جو اسے محض ہندوستانی زندگی سے انتہائی لاعلمی رکھنے کی وجہ سے ہی ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کا اہل ثابت کرتی تھیں۔

ویلزلی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے رستم خانی سکول ماسٹر کا لب ولہجہ اختیار کر لیا

تھا۔ اور ہندوستانیوں کو گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ کی تقریبات سے محروم کر دیا تھا۔ انگریزوں نے ذات پات کی تمیز پیدا کر دی۔ اور میکالے فاتحین کے اس نئے طبقہ کو "برہمنوں کی نئی نسل" کا نام دینے میں بالکل حق بجانب تھا۔

لارڈ ولیم بنٹینک کا مسئلہ بالکل مختلف تھا۔ اُس نے تنخواہیں گھٹا دیں۔ اور اپنے اقتصادی اقدامات کی وجہ سے متواتر زجر و توبیخ کا نشانہ بنا۔ اگرچہ اس نے ہر دیوانی عہدہ دار کے لئے تقریباً ۲۲۰۰ پونڈ سالانہ مشاہرہ رہنے دیا۔ بنٹینک پریس کی آزادی کا حامی تھا اور ہندوستانیوں پر معاش کی ان تمام راہوں کو کھول دینے کے لئے بیقرار تھا۔ جن سے کارنوالس کی حکمت عملی نے ان کو باہر نکال پھینکا تھا۔ مٹکاف بنٹینک کے ملکی انتظام کی بابت لکھتا ہے "اگر اس سے سوال کیا جاتا کہ آیا ہماری رعایا کی بڑھتی ہوئی فلاح و بہبود ہمارے یہاں کے قیام کے بھاری اخراجات کے متناسب تھی تو وہ اپنے اس سوال کے غیر اثباتی پہلو پر یقین کے مطابق جواب دینے پر مجبور ہوتا۔ کیونکہ ہم بیرونی فاتحین ہیں۔ اسلئے قدرتی طور پر اہل ہند کی ہمارے خلاف فطری نفرت عام ہے۔ ہم نے ملک کو محض جبر سے فتح کیا اور جبر ہی سے اس پر قابض رہ سکتے ہیں" بنٹینک کے لئے یہ انتہائی افسوس کا مقام تھا کہ اسے دُنیا کا سب سے بڑا "عبیلہ جنرل" خیال کیا جاتا تھا۔ بنٹینک رحم دلانہ اقدامات اور ان سے بھی زیادہ اپنی تعلیمی حکمت عملی کے لئے مشہور ہے۔

۱۸۵۷ء کا غدر ہی وہ واقعہ تھا جو دفتری حکومت کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ انگریز مؤرخین اُسے عام طور پر فوجی بغاوت سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن اہل ہند کے نزدیک یہ سب سے پہلی جنگِ آزادی تھی۔ آیا یہ ایک منظم صورت میں رونما ہوئی یا مقامی فسادات کا ایک سلسلہ تھی۔ ابھی بحث طلب ہے۔ لیکن اس نے انگریزی ذہن پر گہرے اثرات چھوڑے۔ عوام کے لئے یہ قتل و خونریزی کا ایک صحیح مرقع بن گئی۔ اور ان کی تمام تر توجہ ہندوستان کی طرف مبذول ہو گئی۔ مجھے

امید ہے کہ انگریزی مدارس کے ذمہ وار اصحاب اپنے تاریخی نصاب کو اس تاریک دور کے متعلق تمام یکطرفہ حکایت بیانیوں سے صاف کر دیں گے۔ گاندھی کا محبوب ترین مصنف رسکن بھی اس حامیانہ اور مبہم نظریہ کا اظہار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "جب سے بنی نوع انسان دنیا میں گناہ کی شاہراہ پر گامزن ہوئی، آج تک کبھی بھی اس قدر حیوانیت اور حیوانیت سے بھی ادنےٰ تر ذلت و تنزل رونما نہیں ہوا جس قدر کہ ہندی نسل کے وہ کارنامے جو ابھی ابھی سالِ گذشتہ میں واقع ہوئے"۔ پروفیسر جی۔ ٹی۔ جارج کا بیان ہے "غدر ہندوستان میں بسنے والوں کے دماغی فساد ذہنی انتشار اور قومی مدہوشی کا ذمہ وار ہوا"۔ میں اس وحشیانہ انتقام سے بحث نہیں کروں گا جو غدر کے بعد لیا گیا۔ ایڈورڈ ٹامسن نے اپنی کتاب 'تصویر کا دوسرا رُخ' میں اس مسئلہ پر بہترین طور پر روشنی ڈالی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو اگر یہ کتاب انگریزی مدارس میں داخل نصاب ہو۔ یہ کتاب ہندوستان میں انگریزوں کے رویہ کو تبدیل کرنے میں کافی حد تک مفید ثابت ہو گی۔ غدر کے متعلق خوفناک اور قدرے سچی اور قدرے جھوٹی داستانیں انگلستان میں بیان کی گئیں اور ہندوستان میں باہمی سمجھوتے کا نازک رشتہ توڑ دیا گیا۔

اوّل اوّل شاید سر جیمز سٹیفن نے اس حکمت عملی کا اظہار کیا۔ اس نے "ہندوستان میں برطانوی حکومت کا قیام" کی اصطلاح رائج کی اور جب بھی کبھی نئی حکمت عملی کی ترکیب کا سوال پیش ہوا۔ یہ ہندوستان کے مفاد کی بنا پر حل کیا گیا۔ عہدہ داروں کی ہر قسم کی تنقید کو اس بنا پر دبا دیا گیا۔ کہ ایسا فعل برطانی حکومت کے مفاد کے خلاف تھا۔ خود تنقیدی کا بار جاتا رہا اور حکومت کی رپورٹیں روز بروز لب و لہجہ میں رجعت پسندانہ ہوتی گئیں۔ تحریریں خود سری و خود رائی کا پہلو لینے لگیں۔ اور انتظامِ مملکت ایسے احکام صادر کرنے کا معاملہ بنتا گیا۔ جن کو کسی کے سامنے جائز اور واجب ثابت کرنے کی ضرورت نہ ہو۔

اس ذہنی تبدیلی کی علت معلوم کرنا مشکل نہیں ہے۔ ہندوستانی قوم پرستی نہایت سرعت سے پروان چڑھی۔ اور لوگوں میں سیاسی شعور کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ رجعت پسندانہ طرزِ حکومت کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اور برطانوی حکومت کو لازمی طور پر استبدادیت کی مشین بننا پڑا۔ ہندوستان میں جتنا عرصہ کہ کشورکشائی کا دور دورہ رہا۔ وسیع مشربی اتنی خطرناک نہ تھی۔ لیکن جونہی آزادی کا مطالبہ اغلب ہوا تو معاملہ کو بالکل مختلف شکل دیدی گئی۔ غدر نے انگریزوں کو بالکل ہراساں کردیا۔ اور انہیں سوچنے پر مجبور کردیا کہ وہ اتنے محفوظ نہ تھے۔ جتنا وہ سمجھتے تھے۔ انتظامِ ملکی میں کسی قسم کے اندرونی اختلافات اور ہندوستانی خواہشات سے ہمدردی کا اظہار شاید ہندوستانیوں کی حوصلہ افزائی کرے کیونکہ محض قوم پرست اور سوشلسٹ ہی ایسے ہندوستانی نہیں جو متحدہ محاذ قائم کرسکیں۔ اس معاملہ میں جتنی کامیابی حکومت ہند کو ہوئی ہے اور کسی کو نہیں ہوئی جس نے سول سروس کو قابل ذکر جماعت بنادیا۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستانی اس میں کافی تعداد میں شامل ہوگئے ہیں۔ لیکن ان کی تربیت بھی دفتری حکومت کے طریقوں پر کی گئی ہے۔ اور انہوں نے اکثر متوسط طبقہ کے زیادہ آزادی پسند عناصر کی نمائندگی نہیں کی ہے۔ تھوڑا عرصہ ہوا کہ کیمبرج کے ایک ہوشیار اور قابل ہندوستانی کو آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان میں داخل ہونے پر ممانعت کردی گئی۔ کیونکہ یہ سروس کے مفاد کے لئے مضر تھا۔ بتایا نہیں جاسکتا کہ شاید یہ اسلئے ہوا کہ مختلف صوبوں کے موجودہ تمام وزرا کی طرح وہ بھی جیل کی ہوا کھا چکا ہے۔

صوبائی خود مختاری کے اجرا نے صورتِ حال یکسر بدل دی ہے۔ وزراتیں کسی حد تک عوام کی نمائندہ ہیں۔ اور آئی۔ سی۔ ایس افسروں کو کسی حد تک احکام قبول کرنے پڑتے ہیں۔ پرانے جیلی پرندے (جیل یا تری) کو پولیس کے منتظم کی حیثیت میں دیکھنا کتنا مضحکہ خیز ہے! یہ قابلِ ذکر ہے کہ پرانے مظالم کے انتقام کے لئے کوئی جذبہ بروئے کار نہ آیا۔ مدراس کے کانگرسی

وزیر اعظم نے بتایا کہ اس محکمہ سے میرے تعلقات اسی طرح پُرجوش اور گہرے ہیں۔ اگرچہ کانگریس کا پایاں پہلو اس بیان کو قدرے مشکوک خیال کریگا۔ مدراس کے انگریز چیف سکریٹری اور گورنر سی پی نے کھادی کے تحائف کو قبول فرمایا اور زیب بدن کیا ہے۔ یہ سروسیں علی الرغم التوقع زیادہ دمدار ثابت ہوئی ہیں۔ لیکن ان مملکت کے ناظموں کو ایک ہی دن میں خادم عوام نہیں بنایا جاسکتا بہت سے ممالک میں سول سروس کی اصطلاحی تبدیلیوں کا جواب اس کے خود حکومت کے سیاسی نظریوں میں ردّ و بدل کے جواب سے شدید تر رہا ہے۔ لیکن اس ملک میں کانگریس کی روزافزوں عزت و احترام کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ کیونکہ کانگریس اس گندگی کی صفائی کے کام میں انتہائی کوشش کر رہی ہے۔ جسے انگریز کے ڈیڑھ صد سالہ راج نے قائم ہونے سے روکے رکھا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ایسے عہدہ دار موجود ہیں جو حب وطن سے سرشار ہیں۔ اور وہ اپنے فرائض نہایت خوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ مجھے محکمہ جنگلات کے ایک افسر سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ جس نے مجھے بتایا کہ مجھے اپنے کام سے اس قدر محبت ہے کہ اگر کسی وقت میرا مشاہرہ بالکل کم کر دیا جائے تو بھی میں اپنے کام کو ہرگز ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ اور محکمہ آبپاری کے ایک افسر نے کہا کہ نئے نظام سے مجھے انتہائی خوشی ہے کیونکہ اس نے ایک ایسے نئے بند کی تجویز کا پُرجوش خیر مقدم کیا ہے۔ جسے منظور کرانے میں مجھے ہمیشہ ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

پہاڑی مقامات کی طرف سالانہ ہجرت اس وقت عہدہ داروں کے الگ رہنے کا نشان بنی رہی ہے۔ جہاں وہ عالم تنہائی میں اپنے کاغذات کی جانچ پڑتال کرتے ہیں۔ اور مجسم عجوبہ کپتان ایلیم تو اپنی کتاب "سوراج" میں یہاں تک کہہ گیا کہ تمام یورپینوں کو ہمیشہ کے لئے پہاڑی مقامات پر چلا جانا چاہیئے تاکہ وہ میدانی آب و ہوا۔ عوام اور ان شورش پسندوں کے میل جول سے محفوظ رہیں۔ لیکن آج صوبائی وزارتیں پہاڑی مقامات کی رہائش پر پابندیاں عائد

کر رہی ہیں۔ یہاں تک کہ مرکزی حکومت بھی شملہ کی طرف آمدورفت کو محدود کر رہی ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ سروس میں قابل آدمی رہے ہیں اور ہیں۔ اور وہ صدقدلی سے صوبوں کے نئے حاکموں سے تعاون اور اشتراک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں (اگرچہ شواہد ان کیخلاف ہیں) تو پھر بھی ایک سنجیدہ الزام لگانے سے باز نہیں رہا جا سکتا۔

(۲)

میرا ایک عزیز ترین دوست جس نے اپنی ساری عمر غریب ہندوستانیوں کیخدمت میں صرف کی، کہا کرتا تھا کہ دوسری سب چیزیں نظرانداز کرتے ہوئے انگریزی راج کا سب سے زیادہ مذموم کارنامہ اس کا انتہائی اسراف ہے۔ چند مثالیں اس امر کی وضاحت کریں گی۔ اور شاید حیران کن بھی ہوں گی۔ ایشیائی ممالک میں سے جاپان کو لے لیں۔ جاپان کا وزیر اعظم ۶۲۲ روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔ اور بنگال جس کی آبادی مملکت جاپان کی نصف سے بھی کم ہے۔ اس کا وزیر اعظم ۰۰۰۳ روپے بٹورتا ہے۔

دوسرے جاپانی وزراء میں سے ہر ایک ۰۴۴ روپے وصول کرتا ہے۔ اور ہر ایک سکرٹری ۵۷۳ روپے لیتا ہے۔ اڑیسہ کا چیف سکرٹری ۰۵۱۲ روپے اور بنگال کا ۵۳۳۳ روپے حاصل کرتا ہے کوریا کا گورنر جنرل ۰۴۴ روپے مشاہرہ پاتا ہے، لیکن گورنر پنجاب ۸۳۳۳ روپے تنخواہ پاتا ہے اگر جاپانی عہدہ دار ۴۳۳۳ روپے وصول کرتا ہے تو بمبئی کا ایک ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ۰۵۱۱ روپے سے کم نہیں لیتا اور یہ کہنا بجا ہے کہ رقبے کے لحاظ سے وزیر اعظم بنگال کو وزیر اعظم جاپان کی

تنخواہ کے نصف سے بھی کم تنخواہ لینی چاہیئے۔ لیکن دراصل وہ اس سے چار گنا زیادہ تنخواہ پاتا ہے۔ بنگال کے مختلف محکموں میں افسروں کی کل تعداد ۳۹۹ ہے۔ اور وہ اوسطاً ۱۳۰۱ روپے ماہوار پر گذارا کرتے ہیں۔ جاپانی شاہیت کے متعلق خواہ کچھ بھی کہا جائے۔ میں نے یہ نہیں سنا کہ وہاں بدانتظامی اور رشوت خوری کا دوردورہ اتنا عام ہے۔ جتنا دوسرے ممالک میں ہے۔

ایک اور مثال یورپی ممالک سے لیجیئے۔ پولینڈ صوبہ بہار کی نسبت بہت زیادہ دولت مند ہے اور اس کی آبادی متقابلتاً بہت کم ہے۔ اسکے باوجود وہاں کی جمہوری حکومت کا صدر صرف ۱۶۵۰ روپے ماہوار لیتا ہے۔ جبکہ بہار کا گورنر ۸۳۳۳ روپے وصول کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ہندوستانی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پولینڈ کی حکومت کے صدر سے زیادہ تنخواہ پاتے ہیں۔ پولینڈ میں نیز ہ سے زیادہ افسر نہیں جو ۱۰۰۰ روپے تنخواہ پاتے ہوں۔ لیکن بہار اور اڑلیسہ میں ۱۵۶ سے بھی زیادہ افسر اور عہدہ دار موجود ہیں جو ۱۰۰۰ روپے سے زیادہ ماہانہ وصول کرتے ہیں۔

صوبجات متحدہ امریکہ اور ہندوستان کا تقابل اس سے بھی زیادہ حیران کن ہوگا۔ امریکہ حد درجہ دولتمند ملک ہے۔ اس کی فی کس آمدنی ہندوستان کی فی کس آمدنی سے ۲۲ گنا زیادہ ہے۔ اور وہاں اخراجات زندگی نہایت گراں ہیں۔ سرکاری معلومات (۳۶-۱۹۳۵) کے مطابق امریکہ میں اپنے کام کا ایک ماہر ۳۰۰ یا ۴۵۰ روپے ماہوار مانگ سکتا ہے۔ اور ہندوستانی ماہروں کی رقوم ہمارے سامنے ہیں۔ نیز امریکہ کی آبادی ہندوستان کی نسبت کم ہے۔ اور امریکہ کے محاصل اس سے دس گنا زیادہ ہیں۔ صدر امریکہ کی اہم شخصیت کا ہندوستان کے وائسرائے سے مقابلہ کرنا بے جا نہ ہوگا۔ صدر امریکہ ۱۷۰۶۲ روپے مشاہرہ پاتا ہے۔ اور ہندوستان کا وائسرائے ۲۱۳۳۳ روپے۔ امریکن کیبنٹ کا ہر ایک وزیر ۱۲۴۴۳ روپے لیتا ہے تو وائسرائے کی کونسل کا ہر ایک ممبر ۶۶۶۷ روپے۔ نیویارک سٹیٹ کا گورنر ۷۸۶۵ روپے حاصل کرتا ہے تو یو پی

گا گورنر چھ ہزار روپے وصول کرتا ہے۔

جنوبی ڈکوتا کا گورنر ۲۸۲ روپے لیتا ہے۔ چیف کمشنر دہلی تین ہزار روپے لیتا ہے۔ ایک امریکن چیف جج ۵۵۰ روپے لیتا ہے تو بنگال کا چیف جج چھ ہزار روپے لیتا ہے۔

موازنہ کو مختصر کرنے کے لئے انگلستان کو لے لیں۔ اس کی آبادی ہندوستان کی آبادی کا ۱۲ فیصدی ہے۔ اور اس کے محاصل کی رسیدات حکومت ہند کے ۳۷-۱۹۳۶ کے تخمینہ بجٹ سے ۱۳۱ فیصدی زیادہ ہیں۔ وزیر اعظم وائسرائے ہند سے نصف تنخواہ پاتا ہے۔ ہر جمع کردہ ہزار روپے سے وائسرائے ایک روپیہ لے لیتا ہے۔ لیکن وزیر اعظم برطانیہ ہر جمع کردہ ایک لاکھ روپیہ میں سے ایک روپیہ لیتا ہے۔ اس بنا پر وائسرائے دس گنا زیادہ لیتا ہے۔ انگلستان میں دیوانی ملازم کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ۳۳۳۳ روپے ہے۔ اور ان میں سے اکثر ۷۷۷ روپے سے مطمئن ہو جاتے ہیں مجلس وزرا کا ہر رکن ۵۵۵۵ روپے لیتا ہے۔ اب ان رقوم کا مقابلہ ہندوستانی رقوم سے کریں۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ تنخواہیں اب ہندوستانی بھی پاتے ہیں۔ جو آئی، سی، ایس سروس میں پچاس فیصدی ہیں ان رقوم میں ہندوستانی فوج کے صرفِ کثیر کو بھی شامل کر لیں۔ کے، ٹی شاہ کی کتاب موسومہ "تعمیر وفاق" سے پتہ چلتا ہے کہ مرکزی حکومت کے بجٹ الاؤنس کا ساٹھ فیصدی اندفاعی تدابیر کی نذر ہو جاتا ہے۔ ڈیفنس بجٹ اور اخراجات قرضہ جو کل بجٹ کا ۷۶ فی صدی ہیں۔ کسی ہندوستانی مجلسِ قانون ساز کے ماتحت نہیں ہیں۔ مجھے ایک اہلکار نے بتایا کہ نئی صوبائی خود مختاری کے زیر اثر صوبوں میں بھی محاصل کا تین چوتھائی ضابطہ سے باہر ہے۔ فوجی اسراف تشریح طلب ہیں۔ میرا مطلب زیادہ ہندوستانی فوج سے نہیں بلکہ انگریزی "افواج مقیم" سے ہے۔ چند سال ہوئے، میرے ذہن نشین کرایا گیا کہ ایک ضلع میں ہر دس انگریز فوجیوں کے لئے ایک پلنگ ہے۔ جبکہ ہسپتال کی عام آبادی کے

لہ وہ کالے انگریز، جو اپنی فرعونی ذہنیت کے لحاظ سے گورے انگریز سے بدرجہا رجعت پسند اور آزادی دشمن ہیں

پچاس ہزار نفوس کے لئے صرف ایک پلنگ میسر ہے۔ ایک اسلحہ ساز شہر میں افسروں، مردوں عورتوں اور بچوں کے لئے ہسپتال ہیں۔ اور ایک ہسپتال مویشیاں بھی موجود ہے۔ میں اس جگہ حاجب کلاں (senior chaplain) کے ہاں ٹھہرا۔ اس نے مجھے ایک دیدہ زیب گرجا گھر دکھایا جو اس کے گھر کے بالکل قریب تھا۔ یہ گرجا گھر ایک سکاٹ رجمنٹ کی خاطر بنایا گیا تھا اور اب جبکہ رجمنٹ وہاں موجود نہ تھی، عمارت ویران پڑی تھی۔ اس دیانتدار شخص نے مجھے نہایت سادگی سے بتایا کہ میں اس اعلےٰ معیارِ زندگی سے سخت متنفر ہوں جس کو بطورِ حکومت کا حاجب ہونے کے قائم رکھنے کی مجھ سے توقع کی جاتی ہے۔ وہ ایک ملازم کے ساتھ اوّل درجہ میں سفر کرتا تھا جس کے ذریعہ وہ اپنا سفر خرچ بناتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ ناجائز سفر کے اخراجات طلب کرنے کا رواج بہت ہی عام ہے

حاجب کلاں اور حاجب خورد کی تنخواہیں بالترتیب ۱۴۵۰ روپے ۹۰۰ - ۸۰۰ روپے ہوتی ہیں۔ ایک بشپ میرے خیال میں تقریباً پانچ ہزار روپے تنخواہ پاتا ہے (در اصل ہندوستان میں بہت سے بشپ مبلّغ ہیں اور گورنمنٹ کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لازمی طور پر ان کی تنخواہیں بھی کم ہوں گی) بہت سے پادری اینگلو انڈین کے حقوق حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کا ہندوستانی عوام سے کوئی تعلق نہیں رہتا جو کچھ مجھے اگلے باب میں کہنا ہے۔ وہ انجیل کے ان مبلّغوں پر بھی حرف بحرف صادق آئیگا۔ لیکن واقعات کی اس تصویر کا سب سے زیادہ خوفناک پہلو وہ ہے۔ جس میں ہندوستان کے فاقہ کش عوام کو برطانی لشکریوں کی روحانی بہبودی کا کفیل ہونا پڑتا ہے۔ اور اخراجات کا یہ حصّہ امورِ غیر منتقلہ سے موسوم ہے۔ جس میں نئے آئین کے مطابق ہندوستانی وزرا کو بالکل دخل نہیں۔ اسکا مطالبہ ناجائز نہیں۔ اگر انگلستان برطانی لشکری کو دستافع مذہب کا یقین دلانا چاہتا ہے تو اسے خود اسکا کفیل ہونا چاہیئے اور اس کے لئے ہندوستان کے غریب مسلمانوں اور ہندوؤں کی جیبیں خالی نہ کرنا چاہئیں

(۳)

اینگلوانڈین کے نرالے سوشل اطوار کے متعلق اکثر لکھا جاچکا ہے اور میرے خیال میں اس مضمون میں ٹھیکرے سے فارسٹر تک کے ناپاک ادب میں اضافہ کرنا لازمی نہیں۔

برطانوی اقتدار کے ابتدائی ایام میں حکام ہندوستانی علم وادب میں گہری دلچسپی لیتے تھے۔ ان دنوں جبکہ انگلستان کا سفر چھ ماہ میں کٹتا تھا۔ نقل وحرکت کی اشد ضروریات سے مجبور ہوکر وہ ملک میں قیام پذیر ہو گئے۔ وہ یہاں کے باشندوں سے کم وبیش دوستانہ میل جول رکھنے لگے۔ ان میں اکثر دیسی حقّہ پی کر اور دیسی آسودہ لباس پہن کر خوش ہوتے تھے اور بعض تو ہندوستانی فلسفہ اور زبان میں عالم ہو گئے۔ سر ولیم جونز اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میری تفریح طبع کے بہترین ذرائع معلم نباتات اور پنڈتوں کے ساتھ شغل گفتگو ہیں۔ وہ ہندوستانی تمدّن وتہذیب اور عربی وسنسکرت کے علوم پر مفتون تھا۔ موجودہ ملکی حاکم اسے یہ کہتے ہوئے تعجّب کرے گا کہ "میرے پاس اس قدر برہمن اساتذہ ہیں کہ ان کے سننے کے لئے وقت ناکافی ہے"۔ ہندوستان میں یورپی باشندے دیسی زبان کا اس سے زیادہ علم نہیں رکھتے جتنا کہ وہ مختلف مواقع پر اپنے ملازموں کو حکم دیتے وقت استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ بھی اکثر خوش مذاقی سے نہیں۔ سنسکرت کا تو ذکر ہی کیا۔ جونز نے ایک دفعہ کارنوالس کو لکھا "میں انگلستان میں کبھی بھی ناخوش نہیں ہوا کیونکہ یہ میری طبیعت کے خلاف ہے۔ لیکن میں سچی مسرّت سے بھی ہمکنار نہ ہو سکا۔ جب تک ہندوستان میں اقامت نہ کی"۔ "میں اپنی تمام عمر دائم المریض رہنا پسند کرونگا۔ بہ نسبت اس کے کہ سنسکرت کے اس مخزن کو ادھورا

چھوڑ دوں جس کو میں نے ابھی ابھی شروع کیا ہے"۔

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی کے کچھ حصہ میں اینگلو انڈین کے تعلقات میں نسلی تفریق کے زہر نے نفوذ نہ کیا۔ انگریز تاجروں کو بمبئی اور سورت کے ہوشیار تاجروں کے پاس پاس قیام پذیر ہونا پڑتا تھا۔ اور بہت سے انگریز مغل دربار کی حاضری کو نعمت خیال کرتے تھے۔

سر ایڈون آرنلڈ نے اپنی کتاب "نورِ ایشیا" میں بدھ مت کی اچھوتے انداز میں توضیح کی ہے ہندوستان سے اس کی الوداعی نظم جو وکٹورین ادبی رنگ میں رنگی ہوئی ہے اگرچہ ادبی خوبیوں کی حامل نہیں۔ تاہم ہندوستان کی محبت اور اس کے گرم سرباشندوں کے فراق کے اندوہ و ملال کی آئینہ دار ہے:-

خوش اطوار، نرم خو اور صاحب دل کا پجاری . . . . . . خوش نصیب فرخندہ بخت ہے وہ دل جو دعویدار ہو کہ وہ لاتعداد ہندوستانی بہنوں اور بے شمار ہندوستانی بھائیوں سے پریم کرتا ہے۔

ابھی ابھی ایک اعلیٰ افسر نے جس کی دوستی پر مجھے ناز ہے اور جس کے ہندوستانی احباب کا دائرہ نہایت وسیع ہے، ایک ہندوستانی تبصرے کے درمیان ہندوستان چھوڑنے پر اظہار ملال کیا جونز اور آرنلڈ اور عہدِ جدید میں کرزن اور رونلڈ شے (زٹلینڈ) ہندوستانی تہذیب کی بہت جاذبِ پرشیدا تھے۔ ورنہ محض تصنع پیشہ اشخاص نے ہی میکالے کی تقلید کی ہے، جسے ہندوستانی پیشہ سے سخت نفرت تھی۔ اکثر انگریزوں کی طرح جو فراقِ وطن میں گھلتے رہتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے "کہ گرم ممالک کے تمام میوے اور پھل انگلستان کے باغ کے پھلوں کی برابری نہیں کرتے اور نہ ہی کلکتہ کے تمام محلات لندن کی گلی کی ایک بالائی منزل کی ہمسری کر سکتے ہیں"۔ اس نے خود ایک دفعہ تسلیم کیا کہ جب سے میں نے انگلستان چھوڑا ہے۔ ایک دن بھی خوشی سے نہیں گذرا۔ ولیم جونز کے ساتھ یہ

عجیب و غریب تضاد ہے۔

فاتح کی شاہانہ ادائیں ہمیشہ ناخوش گوار اثر پیدا کرتی ہیں۔ ہندوستان میں انگریز کا خلق و مروت ہندوستان کے مسلسل ماضی کے پس منظر پر نظر ڈالنے سے واقعی ایک طنز ہے۔ اس وقت اس کا نمونہ نہایت ادنیٰ معلوم ہوتا تھا اور کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی تہذیب کا سمت الرجل انگلو انڈیا کے نگار خانوں میں پایا جا سکتا ہے۔ جہاں کہ نواح شہر کی ہر خفت و قلت چھوٹے پبلک مدارس کی علامات کے ہمراہ موجود ہے۔

کوتاہ اندیشی گھر پروان چڑھانے سے اور شدت پذیر ہوتی ہے۔ شاید معاملات قدرے اصلاح پا رہے ہوں۔ لیکن فوجی چھاؤنیاں چند سطحی اور وقتی تبدیلیوں کے سوا جوں کی توں ہیں۔ میم صاحبوں تنوں اور بندوبست کی ابھی تک کثرت ہے۔ ہندوستانی شاذ و نادر دیسی لوگ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ کلکتہ کے کلبوں میں ابھی تک آریہ بھائی کا تذکرہ سنا جاتا ہے۔ ریلوے گاڑیوں میں پہلی سی فرعون مزاجی اور بدخلقی دیکھنے میں نہیں آتی۔ لیکن ۱۹۳۱ء میں مجھے ایک نہایت ہی افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ ہندوستان میں انگریز آبادی ابھی تک بالکل الگ تھلگ ہے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ایک عام برطانی کے لئے ہندوستانی گھریلو زندگی سے راہ و رسم پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ ایک جگہ رہنے سے دونوں کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اگر انگریز اپنے پیشروؤں کے نمونہ کی تقلید کریں اور ہندوستانی لباس پہنیں۔ تو یہ شاندار نتائج کا ذمہ وار ہوگا۔ آب و ہوا کے عین موافق ہونے کے علاوہ یہ حدود کو بہترین طور پر مسمار کر دے گا۔ کھانے کے وقت تنگ لباس میں ملبوس دیکھکر مجھے انگریز پر ترس آتا ہے۔ انتہا کی گرمی میں میں خود سفید دھوتی اور چادر زیب تن کیا کرتا ہوں۔

مجھے ایک دفعہ انگریزوں کے ہوٹل میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ میں اس وقت ہندوستانی

لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک فوجی عہدہ دار نے گوری چمڑی کی عزت و آبرو کی اس بے حرمتی پر مجھے زجر و توبیخ کی (یہ ۱۹۳۸ء کا واقعہ ہے) اس نے مجھ سے خفگی سے استفسار کیا کہ تمہیں اتنا بھی خیال نہیں آیا۔ کہ آدمیت کے معیار کے مطابق انگریز ہندوستانی سے بلند تر ہے۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

لیکن انگریز کے غیر معقول دعاوی اب ہندوستانی کو ہراساں نہیں کرتے۔ اس نے معلوم کر لیا ہے کہ خوشگوار مذاق بازی کے سیلاب میں کہنہ ترین فوقیت اور برتری فوراً منہدم ہو جاتی ہے۔ ابھی تک بعض کلبوں میں ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔ لیکن بہت سے صاحب ذوق بھی موجود ہیں جو ہندوستانی مجلس کو ترجیح دیتے ہیں اور زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ وہ جذبہ نفرت جو ہندوستان میں مقیم انگریزوں کو ابھارتا ہے۔ ہندوستان کی عالمگیر غربت و افلاس اور یہاں کے باشندوں کے عقیدہ تقدیر اور ان کی جبلی منکسر المزاجی کی پیداوار ہے۔ انگریز مستقل مزاجی اور اس نئے آزاد ہندوستانی کے حوصلہ و جرأت کو پسند کرتا ہے۔ جو اس کے بلوں کو اسمبلی سے باہر پھینک دیتا ہے۔ اور پریس اسکے عیارانہ کارٹون بناتا ہے۔ لیکن جو ابھی تک ایک دوست نواز غیر ملکی پر اپنی محبت اور ہمدردی وقف کرنے کے لئے تیار ہے اور جواب بھی شاید اس کا اعتماد حاصل کر لے۔ ہم اب ننگے فقیروں، کے متعلق زیادہ کچھ سننے کیلئے تیار نہیں۔ اینگلو انڈین پریس اب فاختہ کی طرح چوما چھٹی کر رہا ہے

لارڈ ارون باوجود اپنے دفتر کی تکلیف دہ اصطلاح کے ہندوستانیوں میں اتنا مقبول ہوا کہ لارڈ رپن کے بعد اور کوئی وائسرائے نہ ہوا تھا۔ اس نے وقار کا ہوّا ترک کر دیا تھا اور اب لارڈ لنلتھگو بھی اسکے قدم بقدم چل رہا ہے۔ اُس نے مہاتما گاندھی کو کئی دفعہ ملاقات اور بحث طلب امور کیلئے بلایا۔ اور اس میں اپنی غلطی تسلیم کرنے کی مقابلتاً بہتر صلاحیت

موجود ہے۔ مثال کے طور پر اڑیسہ کے تازہ ترین واقعہ کو لے لیں۔ جہاں فیصلہ کیا گیا تھا کہ صوبے کا ایک آئی۔سی۔ایس افسر گورنر کی رخصت پر نیابت کے فرائض انجام دے۔ کانگریسی وزرا نے اس بنا پر مستعفی ہونے کی دھمکی دی کہ حکومت کے سابق ملازم کا عنانِ حکومت سنبھالنا اقتدارِ حکومت کی توہین ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ گورنر نے اپنی رخصت منسوخ کر دی ہے۔ اسی طرح بہار اور یوپی کی وزارتوں کے مستعفی ہونے پر وائٹ ہال اور حکومت کو صلح جو اقدامات کرنے پڑے جن کی برابری صرف مہاتما گاندھی کی محتاط سیاسی گہری ہی کر سکتی تھی۔ یہ خیال پیدا ہونا ناگزیر ہے کہ انگریز نئی صوبائی حکومت میں مکمل حقوق و اقتدار کے حصول کے اصرار پر ہندوستانیوں کا احترام کرتے ہیں۔ کانگریسیوں کی طرف سے افسروں اور گورنروں کے ساتھ ارتباط کو کانگریس ابھی تک روکے ہوئے ہے۔ لیکن مجھے امید ہے کہ یہ حالت زیادہ عرصے تک نہ رہے گی۔ البتہ بابایاں پہلو شاہیت پسندوں کو مراعات عطا کرنے پر سخت نکتہ چینی کرتا ہے۔

لیکن نسل کا زہریلا مادہ کسی طرح بھی نابود نہیں ہوا۔ ہم نازی نسلی زندگی پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ لیکن اس کی ناخوشگوار صدائیں ہندوستان میں بھی سنی جاتی ہیں۔ ذات پات کی تمیز انگریز کے خون میں سرایت کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ میں ہندوستانی، برطانوی تعلقات کے اس ناگوار پہلو پر زیادہ بحث نہیں کروں گا۔ کیونکہ تنقید جذبہ نسلیت کی غذا ہے۔ اس کا بہترین علاج اس کے عنوان و مقدمے سے سراسر انکار اور حتی الوسع اس کی تضحیک کرنا ہے۔ لیکن نسلی تعصب ہندوستان میں ایک ایسے فرقہ کی پیدائش کا ذمہ وار ہے اور ایسے جرم کا مرتکب ہوا ہے۔ جو اپنی نوعیت میں بے مثال اور نادر ہے۔ میرا مطلب یورشین فرقہ سے ہے جو اینگلو انڈین کے نام سے مشہور ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ہندوستان میں انگریز پہلے پہل کیسے اقامت گزین ہوئے۔ اس وقت وہ اکثر مغل امیر طبقے اور دوسروں کے ساتھ متحدہ قانونی یا غیر قانونی واسطہ یگانگت پیدا کرتے تھے۔

اور اکثر یہ ذریعہ اتصال حرم اندازی سے زیادہ معنی نہیں رکھتا تھا اتحاد ہوا فقت کے ان ذرائع کو کم اہم نہ سمجھا جاتا تھا۔ اور انہی سے بہت سے اشخاص ذمہ وار عہدوں پر فائز ہوئے۔ لیکن غدر کے بعد اینگلو انڈین کو الگ کر دیا گیا۔ اور اس سے عجیب وغریب برتاؤ کیا جانے لگا۔ اسے ہندوستانیوں کو نفرت اور حقارت سے دیکھنے کی تلقین کی گئی۔ اسے انگریزی طرز کی تعلیم دی گئی تھی لیکن اسے تعلیم کے اعلےٰ مدارج کے مواقع سے محروم رکھا گیا۔ اور وہ ریلوے یا اسی قبیل کے کاموں میں مزدور بن کر رہ گیا۔ مجھے میرے ایک اینگلو انڈین دوست نے بتایا کہ مجھے کلکتہ کے ایک مشہور ومعروف سکول میں تعلیم دی گئی۔ بہت سے نامور بنگالی وہاں پڑھتے تھے۔ لیکن گورنمنٹ کی طرف سے مجھے کوئی مدد نہ ملتی تھی۔ کیونکہ سنا جاتا تھا کہ میں اینگلو انڈین کی تعلیم کے متعلق حکومت کی مسلّمہ حکمت عملی پر عمل نہیں کرتا تھا۔ اینگلو انڈین طلبا کے لئے اب بھی اعلےٰ تعلیم کا حصول نہایت مشکل ہے۔

آج اس فرقہ کا مقام واقعی المناک ہے۔ الہامی فیض واثر کے لئے انگلستان کو ملجا بنانے کی بچپن سے تعلیم وتربیت اور برطانی مفاد کی مستقل اور مسلسل وفاداری کے گہرے نقوش نے اس کے احساس وطنیت کو فنا کر دیا ہے۔ وہ اپنے دیس میں بدیسی ہیں۔ لیکن برطانی اسے منہ نہیں لگاتے وہ ان سے متنفر ہیں اور اکثر ان کی تحقیر کرتے ہیں۔

ہندوستان کے اچھوتوں کا مسئلہ اگرچہ درجہ میں مختلف ہے۔ لیکن نوعیت کے لحاظ سے وہ اینگلو انڈین کے مسئلہ سے خاص اختلاف نہیں رکھتا۔ موخر الذکر۔ اپنے احساس بے قدری کی کسر ہندوستانی کی تحقیر وتذلیل کے ذریعے نکال لیتے ہیں۔ دونوں نسلوں کے درمیان اس افسوسناک حد بندی کا وجود نسلی تفریق کے زیادہ کرنے میں معاون ہوا۔ عجیب بات یہ ہے کہ آج کل مخلوط ازدواج کی اولاد کا شمار ان کی تربیت ہندوستانیوں کی طرح ہوتی ہے۔ اور جو

ہندوستانی سوسائٹی میں دخل پاتے ہیں۔ ایک عجیب اور مختلف نوعیت ہے۔ ان کا شمار اینگلو انڈین فرقہ میں نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ایک مخصوص سوشل اور تاریخی حیثیت کا مالک ہے۔ آج اس فرقہ کے رہنما قابلِ تعریف حقیقت پسندی کے احساس کا اظہار کرنے لگے ہیں۔ اور ہر دفعہ زیادہ شدّت کے ساتھ اینگلو انڈین۔ کو اپنے اور ہندوستانی مفاد کی موافقت پیدا کرنے پر زور دے رہے ہیں۔ برطانی اسے ہرگز پاس نہ پھٹکنے دیں گے۔ جبکہ ہندوستانی اس اثنا میں اسے گلے لگائیں گے اس کی اقتصادی حالت بالکل خستہ ہے اور مجھے بتایا گیا ہے کہ کلکتہ میں وہ شکستہ حال زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ واجبی آمدنی سے بھی کم پر یورپی معیار کو قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنی اس 'پود' کو کافی حد تک چھوڑ دیا ہے۔ امید ہے کہ ہندوستانی اس کو اپنی قومی زندگی میں دخل دینے کا پورا پورا موقع دیں گے۔ بشرطیکہ وہ اس کے لئے تیار ہوں۔ ان میں بہت سے صاحب شعور افراد ہیں۔ لیکن جن کی باقاعدہ نفسیاتی زندگی کے انقلابات بلند نہیں رہے ہیں۔ انگلستان میں اینگلو انڈین مدارس کے لئے روپیہ کی فراہمی کی کوشش ہوتی رہی ہے۔ ان کا انتظام و انصرام عموماً مذہبی اغراض کے ماتحت رہا ہے۔ اور اہل برطانیہ سے پوچھا جا سکتا ہے کہ اینگلو انڈین کو الگ تھلگ کرنے اور اسے مغربی تعلیم و تربیت دینے (بعض دفعہ وہ کوئی دیسی زبان نہیں جانتے) سے آیا وہ اسے نقصان تو نہیں پہنچا رہے۔ اگر انہیں آخر ہندوستانی آبادی میں ہی گھل مل جانا ہے تو انہیں ویسی ہی تعلیم دینے کی ضرورت ہے۔ نسلیت ایک کائناتی حادثہ ہے۔ اور اس فطری جذبۂ قبیلہ پرستی کا جزو ہے۔ جو اپنی جنس کے ساتھ مطابقت نہ رکھنے والے تمام عناصر کو رد کر دیتا ہے۔ صرف سوشلزم اور پاک ترین مذہب ہی نسل پر فوقیت حاصل کرنے کے امکانات کے حامل ہیں۔

ہندوستان میں مختلف یورپی اقوام کا ذکر میں نے نہیں کیا ہے۔ عدالتی اور فوجی پیشہ افراد کے

علاوہ تجارت پیشہ بھی ہیں۔ چائے کی کاشت اور پٹ سن کی صنعت انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور بڑے شہروں میں تھوک اور پرچون کی تجارتی کوٹھیاں ہیں۔ بمبئی میں اختلاط کا سامان کافی ہے۔ نوجوان ناسمجھوں نے تحریک سول نافرمانی کے دوران میں قوم پرست زاویۂ نگاہ کو سمجھنے کے لیئے طعام کلب بنائی۔ بمبئی میں یہ اقدام ناممکن تھا۔ کیونکہ بمبئی میں ہندوستانی صنعت اور کلکتہ میں انگریزی صنعت غالب ہے۔ اس سے تفریق نمایاں تر ہو جاتی ہے بمبئی کے پارسیوں سے برطانی تعلقات خوشگوار معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانی اعلیٰ ذات والوں کو بنظر حقارت دیکھتے ہیں۔ اور ان کی زندگی بالکل مختلف ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ نوجوان تجارتی بازار میں قدم رکھتے ہیں تو انہیں اکثر ایسا معیار قائم رکھنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ جو ان کی طاقت سے بدرجہا بلند ہوتا ہے اور وہ بڑوں کی زیر تربیت اوباش و بدکار ہو جاتے ہیں۔ ٹاک ایچ نے ان نوجوانوں کے لیئے کلکتہ میں مفید کام کیا۔ لیکن ہندوستانیوں کے ساتھ ان کی راہ و رسم شاذ و نادر ہے۔

پولیس کا وجود محض نکتہ چینی کی خاطر ہے۔ ان کا کام شکریے کا مستحق نہیں۔ لیکن یہ کہنا بجا ہوگا کہ اگر ہندوستانی نفسیات کو بہتر طور پر سمجھتے تو کافی تکلیف سے چھٹکارا ہو سکتا تھا۔ اس جماعت کا فساد و انتشار امر مسلمہ ہے۔ بہت سے لوگ پولیس سے خوفزدہ اور متنفر ہیں۔ صوبوں میں اس کا نسبتاً جمہوری وزارتوں کے قبضۂ اقتدار میں آنا بہت ہی مفید ہے۔ لیکن موجودہ صورت حال میں وہ جبر و جور کا ناگزیر آلۂ کار ہیں۔

غیر ملکی فوج کے اہم ترین مسائل میں سے بہت سے پیادہ لشکریوں کا جبریہ تجرّد ہے۔ حکام فوج چکلوں کی موجودگی پر کبھی بھی محکمانہ اظہارِ پسندیدگی نہیں کر سکتے۔ جو در اصل کثرت سے موجود ہیں۔ چند سال ہوئے۔ جبل پور میں جب ایک لشکری نے ایک دیہاتی لڑکی سے زنا بالجبر کیا تو دیہاتیوں نے اسے خوب زد و کوب کیا۔ فوجیوں نے گاؤں پر حملہ کر کے انتقام لیا۔

جو سخت غلطی تھی۔ یہ کہنا بجا ہوگا کہ انہیں پوری سزا ملی۔ انگریز لشکری عموماً خوش مزاج ہے۔ کھیل کود کا بے حد شوقین ہے۔ لیکن اسے اپنے آپ کو اعلیٰ خیال کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے اور اسے واقعی علیحدہ رکھا جاتا ہے۔ گرم علاقوں میں کام کرنے والے اشخاص کا غیر فطری زندگی بسر کرنا فعل قبیح ہے اور افواج مقیم کا شر و فساد مظلوم و مقیم دونوں کے لئے یکساں مضر ہے غیر ہندوستانی آبادی مثلاً عیسائی مبلغین کے اہم جزو کے متعلق چند اور خطابات لازمی ہیں۔ برطانی کے علاوہ وہ بہت سی اقوام سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن اکثریت اہل امریکہ کی ہے۔ ایک مختصر سی تحریر میں سلسلہ تبلیغ کے پیچیدہ مسئلہ پر بحث کرنا مشکل کام ہے۔ اتنا کہنا ہی کافی ہوگا کہ مبلغین میں ایسے جان نثار مرد اور عورتیں موجود ہیں جنہیں ہندوستانیوں کی تعریف اور عقیدت حاصل ہے اور یہ بحث طلب نہیں کہ مشن مدارس اور درسگاہوں نے ملک کے چند رہنما پیدا کئے ہیں۔ مثلاً صرف سی ایف اینڈریوز کی ذات ہی مبلغوں کے گروہ کو قابل اعتماد بنا دیگی۔ لیکن یہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ہندوستان میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ وہ تبلیغ کے منضبط رابطہ سے علیحدہ رہا۔ اور اس نے اپنے آپ کو ہندوستان کے ساتھ اس طرح مربوط کیا کہ بہت ہی کم غیر ملکی ایسا کر سکے۔

بعض ایسے مبلغین بھی ہوئے ہیں۔ جنہوں نے عملی کام کو اپنا ورد حیات بنایا۔ جیسے موگا اسکول میں ہوا اور یہ بالکل مختلف النوع گروہ ہے۔ مشن کالجوں میں مہذب اور وسیع مشرب اشخاص نے لاتعداد طلبا کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اور ایسے مبلغین بھی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی سرفروشانہ خدمات کرتے گزاری۔ اور وہ ہندوستان کی خاطر اپنی جان پر کھیل گئے۔ انہوں نے غریبوں کی خدمتگذاری کی۔ اور اس نئے رویہ کی تحریک کی جو ملک بھر میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیل رہا ہے۔

اتنا کہنے کے بعد یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ان مبلّغین میں بعض عجیب قسم کے متعصب اور تنگدل اشخاص موجود ہیں۔ اور یہ کافی تعداد میں حکومتی اغراض سے وابستہ اور حکومتی تعارف کے متلاشی ہیں۔ مبلّغین کے لئے حاکم قوم کے ساتھ رابطہ کے پُرفریب اثرات سے محفوظ رہنا نہایت مشکل تھا۔ بعض گہرے جذبہ سلبیّت کے مجرم اور ہندوستانیوں سے برتری اور تنفّر کے احساس کے مورد الزام رہے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان کا واسطہ ادنےٰ ترین افراد تک محدود رہا ہے۔ اور انہوں نے انہی کو دیکھکر ہندوستان کا اندازہ لگانا چاہا۔ ہندوستانیوں نے ہندوستان کی خاطر مٹنے والے مبلّغین کو کبھی نہیں بھلایا۔ بلکہ اس کے برعکس ان کا تشکّر اور محبت کبھی بر صحیح طور پر قبول نہیں کی گئی۔ مبلّغین میں اپنے وطن مالوف کی طرف مراجعت اور ہندوستان کی کمزوریوں اور غلطیوں سے فائدہ اٹھانے کا رجحان عام رہا ہے۔ تاکہ وہ وہاں اپنے کام کے لئے عملی ہمدردی اور چندہ حاصل کر سکیں۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی مسلسل تنقید کے دباؤ کی وجہ سے اب اس میں کمی واقع ہو گئی ہے اور یہ دباؤ عیسائی اور غیر عیسائی دونوں کی طرف سے یکساں ہے۔ غیر عیسائی تو ان کی محض عیسائی بنانے کی مساعی ہی سے تعلق رکھنے کی ذہنیت پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اور خصوصاً جبکہ نو عیسائی اپنے مکمل ایقان اور اپنی روایات کی نسبت غیروں کی اچھی چیزوں سے رواداری برتنے کا صحیح تجربہ بھی نہیں رکھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے۔ چند سال ہوئے ایک ہندو روزنامہ نے نہایت ترشی سے 'مذہبی شاہیت' کی طرف اشارات کئے تھے۔ اس طرح ہسپتالوں، سکولوں اور تعلیمی اداروں کی مفید خدمت اس کے ارتداد کی اغراض شعوری انقیاد کی وجہ سے کمزور کی جاتی ہے بہت سے ہندوؤں نے عیسائی مبلّغین کا ڈاکٹر اسپید کار کو تحریص و ترغیب دینے کے عملی شوق پر اظہار نفرت کیا ہے۔ اور عیسائی مبلغین کے اس روّیہ کا یہ ثبوت ہے کہ ہندوستان کی

تکالیف ان کی ساعت نیک ہیں۔ تبلیغی محاذوں کے متعلق بحث و تحیص اور تبلیغی کام کے
لئے فوجی استعاروں کا استعمال کافی سے زیادہ بڑھ رہا ہے

عیسائی مبلغین اپنے خاص جارحانہ اقدام اور فقدانِ سادگی کے لئے بھی موردِ الزام ہیں
جو کہ اس سادگی پسندی اور منکسر المزاجی کے برعکس ہے۔ جس کو اہلِ ہند روایتی طور پر اپنے آئمۂ
دین سے توقع کرتے رہے ہیں۔ قوم پرست اور سوشلسٹ مبلغین کے ہندوستانی رجحانات سے
عام عدم موافقت پر تنقید کرتے ہیں۔ اہلِ امریکہ اپنے غیر جانبدار رہنے کے منفرد عہد کے
پس پردہ پناہ لے سکتے ہیں، لیکن اس وقت جبکہ صاف گوئی کی اشد ضرورت ہو تو خاموشی کی
اتنی عذر نیوشی کافی نہیں ہے۔ اور برطانوی مبلغین کا ایسا بہانہ تو اس سے بھی زیادہ کمزور ہے
ایک یا دو مبلغین نے ۱۹۳۰ - ۳۲ کی شورش میں غیظ و غصہ کا اظہار کیا۔ ان کے ہم پیشہ اصحاب
نے ان کو ٹھکرا دیا اور ان سے غداری کی۔

کسی دوسری جگہ میں نے 'نصرانی' فرمودات کے بعض اشاروں کا ذکر کیا ہے یہ کہ سیاسی
معاملات فی الحقیقت اخلاقی مسائل ہیں۔ ایک بھولا ہوا سبق معلوم ہوتا ہے۔ اور ایک
عیسائی ان معاملات پر رائے زنی کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو ایک قوم پر دوسری قوم یا بیرونی
غلبہ کی لوٹ مار سے ظہور پذیر ہوں۔ مبلغ خدائی انصاف اور محبت کی تلقین کرتا ہے لیکن
اس کی منافقت کا یہ عالم ہے کہ وہ اس صورت حال میں خاموشی اختیار کرتا ہے۔ جو اسکی
تعلیم کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ بلکہ شیطنت کو دیکھکر وہ دست اعانت دراز کرتا ہے۔ مناسب
یہی ہے کہ تمام مبلغین خیر باد کہکر اپنے گھر کو سدھاریں۔

مبلغین کثیر غیر جانبداری کا فرض بھی بجا لانے میں کوتاہی کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ اپنی
متواضع خدمات کے ذریعہ حکام کی حاضری اور حکومت کی فیاضی کے سایہ میں دم لینے کیلئے

سرگرم رہے ہیں۔ دار الحکومت کی تقاریب اور اسی نوع کے دوسرے مواقع پر حاضر ہونیوالے مبلغین کی تعداد ان اشخاص کی نسبت کافی سے زیادہ ہے۔ جو قوم پرست ہندوستانیوں سے راہ و رسم رکھتے ہیں خصوصاً اگر وہ کانگریسی ہوں مبلغین کے زیر مطالعہ عموماً وہ رسائل ہوتے ہیں جن کی ادارت وہ یورپین کرتے ہیں، جو تعصب کے مرض میں گرفتار ہیں۔ ایک ممتاز ہندوستانی عیسائی نے مذکورہ بالا تنقیح کا اظہار کیا ہے اور یہ عام شیوہ ہے کہ مبلغ سے ہندوستانی عیسائی کے سلوک کی پیچیدگی اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اکثر وہ آقا و غلام کا رشتہ رکھتے ہیں مبلغ حکمت عملی کے مختزع ہونے کی حیثیت سے ہندوستانی کارکن پر اپنی فطرت کا روشن پہلو نمایاں نہیں کرتا ہندوستانی عیسائی کو شکایت ہے کہ مبلغین اور ہندوستانی کارکنوں میں اکثر کسی قسم کی رفاقت عمل نہیں ہوتی۔ مبلغین کا رجحان انہیں سکھانے کا ہے۔ ان سے سیکھنے کا نہیں۔ اور ان کی تنقید قبول نہیں کی جاتی۔ مبلغ اور ہندوستانی عیسائی نہ روحانی تدابیر اور نہ مادی اشیاء میں اصلی معنوں کوئی حقیقی اشتراک رکھتے ہیں، ہندی عیسائی کا افلاس اور تبلیغی اداروں پر اس کا مدار صورت حال کے ناخوشگوار عوامل ہیں۔

اکثر مبلغین صرف تخیل اور خوشامدی لوگوں میں گھرے رہتے ہیں جس سے ان کا ترش ذہنیت اختیار کرنا لازمی ہے۔

کچھ دیر سے واقعی اس ذہنیت کا تجزیہ کیا جا رہا ہے اور بہت سے مبلغین ہندوستان کے قلب سے رشتہ جوڑنے اور موروثی روایات بنگلوں اور دور دراز کار ذرائع کی مشکلات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ آشرم جہاں ہندوستانی اور بدیسی لوگ معمولی سادہ زندگی بسر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور یہاں کے باسیوں کیلئے کافی مفاد کے حامل ہیں فی الحقیقت اصلاح کی جانب ایک قدم ہے۔ لیکن یہ کہنا مناسب نہیں کہ مبلغین کو عموماً عقیدت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، کیونکہ معاملہ اسکے برعکس ہے۔ عوام کا اعتماد اور محبت حاصل کرنے کے لئے انہیں کافی سے زیادہ وقت درکار ہے +

مذہب

"مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا"

اقبالؔ

ہمارے شہر میں فساد ہو گیا ہے۔ لوگ خوفزدہ ہیں۔ خوشگوار زندگی مفقود ہے۔ تمام کاروبار بند ہو گیا ہے۔ یہ تمام کیوں ہوا؟ کسی کو معلوم نہیں محرم کے عین ان ایّام میں جب مسلمان امام شہید کی یاد میں جلوس نکالتے اور ماتم کرتے ہیں۔ چند غیر ذمہ دار لوگوں نے ایک ہندو برات پر حملہ کر دیا۔ اس سال محرم، ہندوؤں کے تہوار ہولی کے بالکل ساتھ آیا۔ اور یہی شورش کا پیش خیمہ ہوا۔ ہولی کے دن ایک دوسرے پر رنگ چھڑکنا ایک رواج ہے۔ اکثر مسلمان اس مذاق سے خوش ہوتے تھے۔ لیکن اب ان کے جذبات کشیدہ تھے۔ صاف لباس پہنے ہوئے مسلمان پر رنگ چھڑکنے کی وجہ سے اعتراض ہوا۔ تُو تُو مَیں مَیں تک نوبت پہنچی ہے بھیڑ لگ جاتی ہے۔ کوئی چاقو نکال لیتا ہے۔ اور شورش کا آغاز ہوتا ہے جس کو افواہیں بے پایاں سرعت سے پھیلاتی ہیں۔

ہندوستانی شہر میں افواہ ایک دہشتناک چیز ہے۔ چند ہی لمحوں میں اوٹ پٹانگ کہانیاں

زبان زد عام ہو جاتی ہیں اور تمام آبادی ہراساں نظر آتی ہے۔ ہندوستانی شہر کا ہجوم فطری طور پر شرافت پسند ہوتا ہے۔ لیکن آسانی سے بھڑکایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں "فرقہ پرستی" کے اسباب معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ عصر حاضر کے منظر کا ایک ناخوشگوار پہلو ہے۔ جو انگلستان میں مشہور و معروف ہے۔ جہاں معمولی سے معمولی فرقہ دارانہ شورش کی افواہ گرم کی جاتی ہے حتیٰ کہ ہر انگریز یقین کر لیتا ہے کہ صرف انگریزی سنگین کی نوک ہی ہندوستانیوں کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے سے باز رکھ سکتی ہے۔ آؤ ذرا اس معاملہ کے مذہبی پہلو کا جائزہ لیں۔

برہمنی ہندو مت کبھی بھی قوانین اور ذہنی قبولیت کا نظام نہیں رہا ہے۔ بلکہ لاتعداد قدامت پسند اداروں اور شکلوں میں رونما ہوا ہے۔ فلسفہ کے اعتبار سے یہ مظاہر پرستی کی ادنیٰ ترین اشکال سے لیکر "ہمہ اوست" کی بلند چوٹیوں تک محیط ہے۔ یہ نہایت واضح رسمی افعال اور عریاں ترین انفرادی روح کی تربیت اور راہبانہ فلسفہ پر مشتمل رہا ہے جن میں وہ تمام بت پرستانہ شان اور چمک بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو اب بھی جنوبی ہند کے مندروں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ اعلیٰ تمدن کا ضامن ہونے کے باوجود بعض اوقات ناپاک ترین بربریت روکنے سے قاصر رہا ہے۔ یہ مت ناقابل بیان حد تک مبہم ہے۔ اور اپنے اندر نسلی، ذہنی اور تمدنی اختلاف کو قبول کرتا ہے۔ یہ تنقیدی ہونے کی بجائے ترکیبی ہے۔ وہ کونسی چیز ہے جو اس حیرت انگیز نظام کے برقرار رکھنے کی ضامن ہے؟

یہ مت نسب روایت اور ملک کی ترگینی نہ ہے۔ روایت زندگی کے تمام سادہ مواقع کے لئے آئین وضع کرتی ہے۔ جو اکثر تحقیق کے بغیر قبول کر لئے جاتے ہیں لیکن خصوصی طور پر اسے کبھی بھی استحکام نصیب نہیں ہوا۔ اس کے رسوم اور رادارات کسی واضح اور تابندہ

اصول کی وجہ سے برقرار نہیں رہے ہیں۔ بلکہ ان کی بقا کا انحصار سماج کی غیر تبدل فضا پر رہا ہے۔ جہاں مذہب کا جوہر عقیدہ پرستی کی جذباتی یا دماغی قبولیت اور یسوع مسیح بطور شافعی اور خداوند، وحدت یزدانی یا محمدؐ کے پیغمبرانہ کردار میں مضمر ہو تو مذہب کی تبدیلی کے لئے نسب کی قید اڑ جاتی ہے۔ کیونکہ تبدیلیٔ مذہب کا نقطۂ آغاز صرف ایقانِ عقیدہ اور عملی زندگی میں اسکے دل کی ماہیت پر منحصر ہے۔ لیکن ہندوئیت کے نظام میں نسب کے امتیاز کو نہایت اہم قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ نظام یقین کا کوئی آئین پیش نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا مدار محض قدیم روایت پر ہے۔ اس لئے اس آریہ برہمنی مذہب میں صرف وہی درجاتی مراتب پر فائز ہو سکتے ہیں جن کی نسبی فضیلت مسلّمہ ہو۔

"وہ جس کا نسب بلند نہیں۔ وہ چاہے مذہبی معاشرت کی کتنی ہی متابعت کیوں نہ کرے۔ اس کے ساتھ اپنے اس روحانی الحاق کا دعوے نہیں کر سکتا جب تک اس نے موروثی ترسیل کے ذریعے اس کے متعلقہ اثرات، نظریات اور جذبات کو حاصل نہ کر لیا ہو۔ تمام نظام پر نسب کا تخیل غالب ہے"

برہمنیت میں تیسرا بڑا عنصر پایا جاتا ہے، غالباً شنتو کے سوا مذہبی نظام اپنی جنم بھومی سے ہندومت کی طرح وابستہ نہیں۔ دوسرے مذاہب اپنی جائے پیدائش کو زیارت گاہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن ہندوؤں کے لئے مٹی ہی خاص فضیلت کی حامل ہے۔ اسی لئے منو کے قوانین بلند نسب ذاتوں کو اپنا ملک چھوڑنے سے منع کرتے ہیں۔ یہ ہندو تمدن ہی ہے جو زمین کو تقدس کا جامہ پہناتا ہے۔ اور اقامت کے قابل بناتا ہے۔ آریہ تمدن کے جغرافی انتشار کے ساتھ ساتھ یہ تصور بھی پھیلتا رہا حتیٰ کہ تمام برِ اعظم پر چھا گیا۔ اس کا خیالی اظہار تمام ملک کی عبادت گاہوں اور مندروں کے وسیع جال

(۱) "ہندوستانی قومیت" مصنفہ دت

ہیں ہوا جس نے ان کو تمدنی وحدت عطا کی "ہندوستان کی اس آئیڈیل وحدت میں مقامات کی زیارت سے خاطر خواہ اضافہ ہوا جس نے لوگوں میں اس جغرافیائی احساس کی نشو و نما کی جو انہیں یہ سوچنے اور محسوس کرنے کے قابل بناتا ہے کہ ہندوستان محض جغرافیائی طبقات کا اجتماع نہیں ہے بلکہ واحد، اگرچہ عظیم الشان جسم ہے۔ جس کی رگ رگ میں زندگی موجزن ہے"۔[1]

گیارہویں اور بارہویں صدیوں میں

ہندوستان کے اس محدود نظام کو ایسے نظام کا سامنا کرنا پڑا جس سے یہ کوئی مطابقت اور اختلاط پیدا نہ کر سکتا تھا۔ اسلام ہندوستان میں وسط ایشیا کی اجنبی روایات اپنے ساتھ لایا اور اس کا منہ مکہ کی طرف موڑ دیا گیا۔ مسلمان حملہ آور اپنے ساتھ ایک ایسا مکمل اور تاریخی مذہب لائے جن کی پشت پر ہندوستان میں آنے سے پیشتر تین صدیوں کا شاندار ماضی تھا۔ پہلے پہل ان کا رجحان ہندوستان کو اپنا گھر بنانے کا نہ تھا۔ وہ اسے ایک مفتوح ملک سمجھتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان تاجروں نے جنوب میں کسی حد تک اقتصادی فتح حاصل کر لی تھی۔ اور تبلیغ کے ذریعہ ہندومت سے خارج شدہ ہندوؤں کو اسلام کے دامن میں پناہ دے کر اپنی تعداد بڑھالی تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح عیسائیت آج کل کر رہی ہے۔ بارہویں صدی میں اور ۱۳۲۶ء میں دہلی کی بادشاہت کے قیام تک ہندو سوسائٹی کو مسلمانوں کی غارتگری سے کوئی کم نقصان نہ پہنچا۔ لیکن اس دور فتوحات میں ہندوؤں کے احساسات کیا تھے؟ ان کو ظاہر کرنے کے لئے کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ اگرچہ راجپوتانہ کے مؤرخین اپنے دشمنوں کو اسورا س کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جو آرین دیوتاؤں کے روائتی دشمن ہیں۔ حملہ آور اپنی مستقل حیثیت کی وجہ سے ساکا اور ہن

[1] "ہندو تمدن میں قومیت" مصنفہ آر۔ کے مکرجی

کی طرح برہمنی نظام میں جذب نہ ہو سکے۔ اور انہوں نے اپنے علیحدہ وجود کو قائم رکھا۔ اس علیحدگی کے قیام کا سبب ہندو نظم و نسق سے اختلاط کی ضرورت کا فقدان تھا۔ حکمرانوں کی طرح انہوں نے بڑے شہروں پر قبضہ کیا۔ صوبائی درباروں کی شان کو بڑھایا۔ ٹیکس اور لگان وصول کئے۔ اور عالیشان محلات اور مساجد تعمیر کیں۔ یہ سراسر ایک فوجی اور انتظامی حکومت تھی اور انہوں نے ہر ایک قسم کی نوابانہ حکومت کی تشکیل کی۔ اُس نے وسط ایشیا کی روایات کو زندہ رکھا یہ ہندوستان کے زمانہ اوّل کی دستوری حکومت اور عمومی جمہوریت سے بالکل مختلف تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا۔ اُس نے ہندوستان کے روایتی، سماجی اور مذہبی ضوابط کو جوں کا توں رہنے دیا۔ یہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت نسبتاً بہت ہی کم سماجی تفریق کی ذمہ وار ہوئی۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کے عہد تک اس نے غیر معمولی رواداری سے کام لیا۔ مثال کے طور پر یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ محض ہندوؤں کے جذبات کے احترام کے پیشِ نظر عام گائے کشی ممنوع تھی۔

جب اس حکمت عملی سے پہلو تہی کی گئی تو اورنگ زیب کی خدمت میں ایک احتجاجی عریضہ ارسال کیا گیا۔

"اگر جہاں پناہ، ان کتابوں پر جو امتیازی حیثیت کی وجہ سے مقدس کہلاتی ہیں۔ کچھ یقین رکھتے ہیں۔ تو ان میں خود بدولت کو یہ ہدایت ملے گی۔ کہ خدا تمام بنی نوع انسان کا خدا ہے۔ محض مسلمانوں کا ہی نہیں۔ بت پرست اور مسلمان اس کے حضور میں برابر ہیں۔ رنگ کی تفریق اس کی مقرر کردہ ہے۔ وہی خالق ہے۔ آپ کی عبادت گاہوں میں دعا کی ایک صدا بلند ہوتی ہے۔ ایک بت کدہ میں

جب گھنٹی بجتی ہے۔ صرف وہی موضوعِ پرستش ہے۔ دوسرے ہم جنسوں کے
مذہب اور عبادت کی تکذیب خدا کی خوشنودی کی توہین کے مرادف ہے"۔

یہ پاکیزہ عبارت سلسلہ خیال کے اس ارتقا کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جو ہندو مسلم تعلقات کا لازمی نتیجہ تھے۔ سماجی زندگی میں دونوں فرقے الگ الگ رہے۔ لیکن تصوّری حکمت میں دونوں کا کافی اختلاط رونما ہوا۔ رامانند اور اس کا چیلا کبیر اس کی مثال ہیں۔ کبیر ایک مسلمان جولاہا تھا اور وہ ایک ایسے فرقے کا بانی ہوا جو اب تک موجود ہے۔ اس فرقے کے لوگ اللہ اور رام کے ایک ہونے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ کبیر نانک کا جو سکھ فرقہ کا بانی ہے، جدِّ اعلےٰ تھا۔ اگرچہ موخرالذکر کو بعد میں مسلمانوں سے دشمنی مول لینے پر مجبور کیا گیا۔ ان کا مذہب زیادہ تر ہندو مت اور اسلام کے قوانین کی آمیزش کا نتیجہ تھا۔ اختلاط کی روح بعد میں اکبر کے دینِ الٰہی میں ظاہر ہوئی۔

انگریزی حکومت کی عملداری نے ہندو مسلم تعلقات پر زیادہ سیاسی رنگ چڑھا دیا۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انیسویں صدی میں مذہبی سرگرمی کی ایک تیز لہر ہندوستانی اسلام میں عرب کے آزاد خیال وہابیوں کے ذریعے داخل ہوئی۔ یہ تنازعہ کہ خطبہ جمعہ میں کس کا نام لیا جائے؟ قیصر ہند کا یا خلیفہ اسلام کا، نہایت دلچسپ تھا۔ وہ جو آخرالذکر کے حامی تھے۔ قدرتی طور پر انگریز دشمن ہو گئے۔ ہمیں معلوم ہو گا کہ اس تعصب کی گرفت ڈھیلی نہ ہوئی۔ مگر انگریز دشمنی کے جذبات ختم ہو گئے۔ ہندو مسلم دونوں نے غدر میں حصّہ لیا۔ برطانی عملداری کے ایّامِ اوّلیں میں مسلمان ہی خصوصیت سے مخالفت پر تلے ہوتے تھے۔ اور ایک حاکم قوم سے جو مغلوب ہو جائے۔ یہی توقع کی جا سکتی تھی۔ ایک مضمون نویس کارنامیکٹیس کے نام سے ایشیاٹک جرنل میں ۱۸۲۱ء میں لکھتا ہے "مملکتِ ہند کے نظم و نسق

کیلئے ہمارا مقولہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" ہونا چاہیئے۔ اور لفٹنٹ کوک، نے اس کا اظہار کیا۔ "ہماری انتہائی کوشش اس بُعد کو جو مختلف مذاہب اور نسلوں کے مابین ہے۔ شدت کے ساتھ برقرار رکھنے میں صرف ہونی چاہیئے۔ اور ان کی موافقت کی کوئی کوشش نہ کرنی چاہیئے"۔ وہ اور ایلفنٹس دونوں (۱۴ مئی ۱۸۵۸ء کی ایک تحریر میں) "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول میں متفق الرائے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ہندو کی خوشامد اور چاپلوسی ضروری ٹھہری۔ لارڈ ایلین برا نے ۱۸۴۳ء میں لکھا "میں اس یقین کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری دشمن ہے۔ اس لئے ہماری حقیقی حکمت عملی ہندوؤں سے مصالحت کی ہے"۔ پھر سومنات کے دروازوں کو واپس کرنے کی تجویز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ہندو اس کے برعکس نہایت خوش ہیں۔ یہ انتہائی نا عاقبت اندیشی ہوگی کہ جب ہمیں ۱/۱۰ آبادی کی مخالفت کا یقین واثق ہو تو ہم ۹/۱۰ وفادار آبادی کی پرجوش معاونت حاصل نہ کریں"۔

فارسی کا اخراج دونوں فرقوں کی تعلیم میں انتشار کا باعث ہوا۔ مسلمان نئی انگریزی تعلیم سے الگ تھلگ رہے۔ ۱۸۴۴ء میں لارڈ ہارڈنگ نے مغربی تعلیم یافتہ اشخاص کو ترجیح دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان حکومت کی ملازمتوں سے باہر نکال دیئے گئے۔ اور ان کی جگہیں ہندوؤں سے پُر کی گئیں۔ غدر ہندوؤں کی نسبت مسلمانوں کے لئے زیادہ مصائب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ آریہ سماج کے ہندو مذہبی احیا کے محاربانہ جوش نے بھی مسلمانوں کو چوکس کر دیا لیکن جب سر سید احمد نے حکومت کی برکت کے طفیل ۱۸۷۵ء میں علیگڈھ مسلم کالج کی بنیاد رکھی۔ تو اس نے دونوں فرقوں کو ہندوستان کی دو آنکھوں سے خطاب کیا۔ اور اس

پر زور دیا کہ ہندوستان کے تمام باشندے ایک ہی قوم کے افراد ہیں۔ لیکن نئی قائم شدہ کانگریس سے تین سال تک علیحدہ رہنے کے بعد اس نے اس کے خلاف اعلان کر دیا۔ چنانچہ ہندو قومیت کی بڑھتی ہوئی مخالفت کے سدِّ باب کے لئے حکومت کو نئی چالیں چلنا پڑیں۔ اور اس نے اقلیتوں کے بہی خواہ اور ان کے حقیقی محافظ کا بھروپ بھرنا شروع کر دیا۔

جبکہ ہندو انگریزی تعلیم ۱۸۱۸ء سے حاصل کرتے رہے تھے۔ مسلمانوں نے صرف ۱۸۷۵ء میں اس کی طرف رجوع کیا۔ اور اس عرصہ میں مشترک تمدن کی بہت سی کڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ نئی کڑیوں نے ہندوؤں کو متحد کر دیا تھا۔ لیکن ان سے مسلمانوں کی علیحدگی زیادہ شدت پذیر ہو گئی۔ ان میں کمتری کا احساس شروع ہو گیا۔ اور حکومت پر ان کا تکیہ بڑھتا گیا۔ اس کے علاوہ اپنی قوتوں کو فرقہ وارانہ معاملات پر مرکوز کرنے سے وہ پان اسلامک اثرات کی طرف مائل ہوتے گئے۔ اور آریہ سماج کی طرح اسلام میں بھی ایک انتہا پسند اصلاحی تحریک پیدا ہو گئی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ایک حکم جاری ہوا کہ یو۔پی کے پبلک دفتروں اور کچہریوں میں ناگری رسم الخط رائج ہو۔ اس سے تفریق کی ایک اور دیوار کھڑی ہو گئی۔ اردو اور ناگری رسم الخط کے نسبتی محاسن و عیوب کا تنازعہ ابھی گرم ہے

تقسیم بنگال نے صوبے کو ہندو اور مسلم حصوں میں بانٹ دیا۔ سٹیٹسمین (کلکتہ) لکھتا ہے کہ دوسرے مقاصد کے علاوہ اس کی غرض "مشرقی بنگال میں ایک مسلم طاقت کی پرورش ہے جس سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہندو طبقہ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کا اثر رکھیگی تقسیم کے خلاف اضطرابی لہر نے قوم پرستی کی تحریک کی کافی حد تک نشوونما کی لیکن اس نے ہندو مسلم خلیج کو وسیع کر دیا۔ اپنی نئی قوت سے حوصلہ پاکر مسلمان یہ سمجھے کہ برطانیہ اس کی پشت پر ہے

اور واقعی سر بی فلر نے یہ فاسفانہ بیان دیا کہ اس کی دو بیویوں میں مسلمان زیادہ مقبول ہے۔
اسی وقت مبلغ احیائے اسلام کے لئے باہر بھیجے گئے جو انتہائی اقدامات کی تلقین کرتے تھے
جس سے فسادات کا ظہور اور ہندوؤں کے لئے دہشت کا عہد شروع ہوا۔ یہ کہنا نامناسب
نہ ہوگا کہ حکومت نے دونوں فرقوں میں ہولناک منافرت پیدا کر دی۔
یہ تجویز ہوئی کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کریں۔ اور ۱۹۰۶ء میں لارڈ منٹو سے مجوزہ
اصلاحات میں یہ مطالبہ پیش کرنے کے لئے ایک وفد مقرر ہوا۔ اور ایک آل انڈیا جماعت کے
قیام کا مطالبہ جو ۱۹۰۰ء سے مخفی تھا۔ دوبارہ زندہ کیا گیا۔ اور مسلم لیگ ڈھاکہ کے مقام پر
قائم کی گئی۔ اس کے مقاصد میں حکومت برطانیہ کی وفاداری کو تقویت دینا۔ اسلامی مفاد کا
تحفظ اور بین الفریق اتحاد قرار پائے۔ ریمزے میکڈانلڈ نے ۱۹۱۱ء میں اپنی کتاب میں
لکھا "شبہ کیا جاتا ہے کہ مسلم رہنما چند اینگلو انڈین حکام کے ذریعے ورغلائے گئے ہیں اور
اس طرح مسلمانوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کر کے رنجش کا بیج بو یا گیا ہے" ۱۹۰۹ء جداگانہ
انتخاب لیگ کے نظام نامہ کا ایک جزو قرار پایا۔ ۱۹۱۰ء میں لیگ نے آغا خاں کو مستقل
صدر بنایا۔ لیکن انہوں نے ترکی سلطان کو امیدوں کا مرکز بنانا شروع کیا۔ برطانیہ اور
سلطان کی دوستی کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ اور اس نے اصل معنوں میں پان اسلام ازم کی
تحریک شروع کر دی۔ مسلمان ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ سے اور بھی مایوس ہو گئے اور
جنگ بلقان کا تو ان پر بہت گہرا اثر پڑا۔ ۱۹۱۲ء میں لیگ نے اپنا نصب العین سلف
گورنمنٹ قرار دیا۔ اور وفاداری کی دفعہ کو اڑا دیا۔ جنگ عظیم کے خاتمہ کے قریب مسلمان
ہوم رول تحریک میں شامل ہو گئے اور ۱۹۱۶ء میں لیگ اور کانگرس کے درمیان لکھنؤ
پیکٹ ہوا۔ لیکن جداگانہ انتخاب قبول کر لیا گیا۔ ہم جانتے ہیں۔ جب گاندھی نے

تحریک خلافت کو قبول کیا اور اپنا کام سمجھ کر اس کی حمایت شروع کردی تو اتحاد قائم ہو گیا فرقہ پرستی ۱۹۲۲ء اور ۱۹۲۴ء میں پروان چڑھی۔ اتحاد کانفرنس اور نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء) پاٹ بند کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ دوسری سول نافرمانی میں مسلمانوں کی جنہوں نے تحریک میں حصہ نہیں لیا تھا۔ دوکانوں پر پکٹنگ کو برا منایا گیا۔ لیکن بہت سے مسلمانوں نے کانگریس کا ساتھ دیا۔ اور عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی پالیسی جس کی پشت پناہ پنڈت نہرو تھے قدرے کامیاب ہوئی۔ صوبائی انتخاب میں کانگریس چند مسلم نشستیں جیتنے میں کامیاب ہوئی اور ہر ایک کانگریسی صوبے میں مسلمان وزیر بھی ہیں۔ اس حکمت عملی نے مسلم لیگ کو اور بھڑکا دیا اور اس نے وزارتوں کو بدنام کرنے اور فرقہ دارانہ فسادات کو ہوا دینے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ابھی ابھی کانپور میں مسلمان وزیر حافظ محمد ابراہیم پر حملہ کیا گیا اور بہت سے فسادات ہوئے۔ یہ سطور لکھتے وقت مسلم لیگ کے لیڈر مسٹر جناح، مسٹر گاندھی اور صدر کانگریس کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ اور ابھی تک نتائج شائع نہیں ہوئے۔

یہاں ایک مشہور کانگریسی مسلمان اور پرجوش سوشلسٹ کی رائے کے مطابق فرقہ دارانہ مسئلہ جاگیرداری سے وراثت میں آیا ہے۔ یہ مذہبی کی بجائے اقتصادی اور تمدنی ہے۔ آزاد ہندوستان نے ایک طاقتور متوسط طبقہ پیدا کیا ہوتا۔ جو جاگیرداری کے تمام نشانات کو ملیا میٹ کر دیتا۔ [جاگیرداری کی اصطلاح کا ہندوستان میں غلط استعمال ہو رہا ہے۔ کیونکہ نہ ہندو سماجی نظام اور نہ ہی مسلمانوں کا نیم تجارتی اور نیم فوجی امیرانہ نظام مغربی جاگیرداری کی مانند ہے۔ بلکہ اس لفظ کو سرمایہ دارانہ نظام سے پیشتر نظام کے معنوں میں استعمال کرنا چاہئیے] ایران میں ترقی پسند طاقتیں قدیم تمدنی ضوابط کے اثرات کو مٹا رہی ہیں۔ یہی کچھ ترکی میں ہوا۔ اور مذہب کی طاقت ان پر غالب نہ آسکی۔ جب مذہب کی ترکیب و ساخت زوال پذیر تمدنی ضوابط سے ہو تو یہ اپنا اثر و اقتدار کھو دیتا ہے۔ جیسا روس اور ترکی میں ظاہر ہوا۔ انگلستان میں مذہبی عناصر

نے ترقی یافتہ متوسط طبقہ سے اتفاق کیا اور مذہب اندرونی اصلاح کے لئے کافی ذمہ دار ہوگیا۔ یہ امر تنقیح طلب ہے کہ آیا ہندومت یا اسلام نئے حالات کے ساتھ موافقت پیدا کرنے کیلئے کافی لچکدار ہیں یا نہیں اگرچہ دونوں میں ایسے عناصر ہیں جنکو اشتراکیت اپنی جانب کھینچ لے۔

ہندوستان میں بھی تیسری جماعت کا وجود برابر رہا ہے۔ شاہیت پرستی لازمی طور پر ہندوستانی سرمایہ داری کی نشوونما میں مزاحمت کا اثر رکھتی ہے۔ اور بعض دفعہ اس نے ارادتاً جاگیرداری عناصر مثلاً تعلقدار، ہندوستانی شہزادے یا فرقہ پرستانہ قسم کے قدیم ترین اداروں کی ترویج کو استقلال بخشتا ہے۔ انگریزی عہد کے ایام اولین میں حکام نہایت خوشی سے مصلحین کے ساتھ تعاون کرتے تھے۔ چنانچہ راجہ رام موہن رائے نے ستی کے استیصال کے لئے لارڈ بینٹنگ کے ساتھ تعاون کیا۔ حکام راسخ العقیدہ جماعت کی مخالفت مول لینے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اس لئے انہوں نے تمام مذاہب کی طرف غیر جانبداری کا اعلان کردیا۔ خارجی حکومت انتہا پسندانہ سماجی اصلاحات کی ذمہ دار نہیں ہوسکتی۔ جس کا نتیجہ مذہبی غیر جانبداری اور اکثر سے زیادہ پرانی خرابیوں کی پابندگی ہے۔

کانگریس غیر مطمئن متوسط جماعت کے مطالبات کے اظہار کے باعث بڑھی۔ اور اس صورت میں اسے ترقی پسند چال چلنا تھی لیکن خاص مجبوریوں کی بنا پر اس کا دائرۂ عمل بہت محدود تھا۔ گاندھی کا اچھوتوں کے بارے میں اقدام اس کی مثال ہے لیکن مسلمانوں پر نیم جاگیرداری طبقہ چھایا ہوا تھا۔ مسلم عوام حد درجہ انقلاب پسند ہیں ہمیشہ کسی نہ کسی چیز کیلئے مضطرب وہ اپنے اخلاص کیوجہ سے تیز رو آزاد خیالی کیطرف چل پڑتے ہیں لیکن فرقہ پرستوں اور کانگریس میں بھی ان کی صحیح قیادت کرنیوالا نہیں ملتا۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں مسلمان گاندھی سے مانوس ہو گئے تھے۔ کیونکہ ظاہراً وہ انقلابی نظر آتا تھا۔ اور اسی طرح وہ اب جواہر لعل نہرو کی طرف کھنچ گئے۔ لیکن کانگریس ابھی تک کسی حد تک سرمایہ دار طبقہ سے پیوند لگائے ہوئے ہے اور اس کا بہت کم فیصدی شعوری طور پر انقلاب

پسند ہے۔ اور اسکی تمام قوتیں نرم مزاج، سوشل اصلاح پسندی میں صرف کی جاتی ہے۔ لیکن یہ مسلمانوں کے لئے کافی نہیں۔ وہ ہندو سرمایہ دار سے خائف ہیں کیونکہ ملکی سرمایہ کی آمدنی میں ان کا حصہ تقریباً چار فیصدی ہے۔ مسلمانوں کی بھاری تعداد کاریگروں، پیشہ وروں اور ریشم اور غالیچہ بافوں پر مشتمل ہے وہ جو پہلے ہی ہندوستانی اور بیرونی مشینی سامان کے مقابلہ میں ابھی پسے نہیں ہیں، اسی خوف سے ہراساں ہیں کہ ان کی باری جلد آئے گی، شہروں میں مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ غریب ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں رائے دہندہ عناصر زمیندار طبقہ یا اس سے تعلق رکھنے والوں پر مشتمل ہے۔ جداگانہ انتخاب اہم ترین مسائل سے توجہ ہٹانے کے لئے گروہی نعرہ بنا لیا گیا ہے۔ مسلم لیگ کا مغز زمینداروں اور ان اشخاص پر مشتمل ہے جو کانگریس کے زرعی قوانین سے ہراساں ہیں۔ لیکن آج چونکہ کانگریس کا مقابلہ کرنے کیلئے انہیں مسلم عوام کی ضرورت ہے۔ رابطہ عوام کی تحریک نے انہیں خوفزدہ کر دیا ہے وہ ایک اندرونی تناقض میں گرفتار ہیں۔ مکمل آزادی اور ایک مبہم اقتصادی پروگرام کی بنیاد انہیں قبول کرنا پڑی۔ لیکن اپنی اعلیٰ مجالس اور بنیادی انجمنوں کے انتخاب میں انہوں نے جمہوری طرز کو خیرباد کہہ دیا ہے۔ مسلم لیگ اپنے ترکیبی تناقض کی وجہ سے ہی شاید اپنی موت مر جائے۔ لیکن کانگریس بھی تناقض سے خالی نہیں ہے۔ اگر دایاں بازو کسانوں اور مزدوروں میں عمومی تحریک کی نشوونما روک دے تو وہ شاید مسلم اعلیٰ طبقہ اور اسکے متوازی قدرے متوسطائی ہندو عناصر کے لئے جاذب بن جائے۔ لیکن اگر وہ دیہاتی پروگرام اور شاہیت پرستی کی مخالف حکمت عملی کے مطابق قدم بڑھائیں تو وہ عوام کو اپنے ساتھ پائیں گے۔ اور فرقہ پرستی کو شکست دیں گے۔ ابھی تک مسلم سوشلسٹ البتہ فرقہ پرور راہنماؤں کے ساتھ گفتگو کرنیکو رجعت پسندانہ اقدام خیال کرتے ہیں۔

اگر فرقہ وارانہ مغائرت کو کم کرنا مقصود ہے تو کانگریس کو اپنے اقدامات کا خاکہ نہایت احتیاط

سے تیار کرنا ہوگا۔ زبان اور تمدن کے معاملات میں احکام صادر کرنے کی کوئی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ مثلاً سوویٹ یونین میں مختلف نسلوں کے لئے جن پر یونین مشتمل ہے۔ زبان اور تمدن کی مکمل آزادی ہے۔ کانگریس کو اپنی ہر ممکن کوشش ان لوگوں کو جواب دینے میں صرف کرنی چاہیئے جو کانگریس کو ہندوئے غلبہ کا ایک ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ یہ انتہائی بدقسمتی ہے کہ بعض جگہوں پر کانگریسی راہنما پرجوش آریہ سماجی بھی ہیں۔ ہندی کو ہندوستانی روزمرہ قرار دینے کی حکمت عملی سے مسلمان بسیخ پا ہیں۔ دراصل آسان ہندوستانی اردو یا ناگری رسم الخط میں لکھی جا سکتی ہے۔ رومن رسم الخط کے متعلق کافی لکھا جا سکتا ہے اسکے کافی سے زیادہ عملی فوائد ہیں۔ اس سے درسی نصابی کتابوں کی قیمت کم ہو جائے گی۔ نیز یورپی زبانوں کی تدریس میں آسانی ہو جائے گی۔ صدر کانگریس نے اس کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے۔ لیکن یہ اغلب نہیں کہ ہندوستانی قوم پرست اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اگرچہ یہ رسم الخط ترکی، چین کے بعض حصوں اور سوویٹ یونین میں رائج ہے میرے مسلمان دوست کا یقین تھا کہ فرقہ دارانہ مسئلہ طبقاتی تنظیم سے حل ہوگا۔ اگرچہ یہ لفظ ڈراؤنا ہی کیوں نہ ہو۔ ہندو اور مسلمان یونین میں اشتراک کے ذرائع بہ نسبت اس جماعت کے جو ان کی اسامی بازی کرتی ہے زیادہ پاتے ہیں۔ یہ قابل ذکر ہے کہ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے نمائندے عوام سے کوئی رابطہ نہ رکھتے تھے اور نہ ہی وہ ان کے چنے ہوئے تھے۔ انگریزی تجارتی اغراض مسلمان ارادے کی حوصلہ افزائی کر رہی ہیں۔ بنگال میں مسلم چیمبر آف کامرس کی وہی پشت پناہ ہیں۔ اور اس صوبے میں یورپین اپنے جائز حق سے پانچ گنا زیادہ نمائندگی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بے شمار گروہی اغراض تمام ترقی پسند اور جدید نشو و نما کے خلاف جنگ آزما ہیں۔ شاہیت کو اپنے عمل کے لئے ایک مجہول سرزمین کی طلب ہوئی۔ اور وہ تمام

ا؎ مسلم لیگ کا دعویٰ ہے کہ کانگریس اور ہندو مہاسبھا میں کوئی فرق نہیں ۔

ترقی پسند میلانات سے متصادم ہوتے اور تشدد سے روکنے پر تُلی ہوئی ہے۔
پنڈت نہرو پر سخت نکتہ چینی کی گئی ہے۔ کیونکہ اس نے کہا ہے۔ سیاست مذہب سے پاک ہونی چاہیئے۔ لیکن ایسا ضرور ہونا چاہیئے۔ جب ایک عیسائی نے کہا "میں پہلے ہندوستانی اور بعد میں عیسائی ہوں" تو میرا خیال ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میرا مذہب قومی سیاست کا محض ایک ضمیمہ ہے، بلکہ یہ تھا کہ میں مذہب کو اجازت نہیں دُونگا کہ وہ مجھے اپنے ہندوستانی ساتھیوں سے جدا کر دے۔ وہ مذہب جو اشخاص کو مکمل افراد بنا کر انہیں مکر و فریب سے پاک اور خود غرضی سے منزہ کر سکتا ہے سیاست کا اثاثہ ہے۔ لیکن جب نہرو یہ کہتا ہے تو وہ بالکل سچ کہتا ہے کہ سیاسی مذہب رجعت پسند اور قدامت پرست ہے۔ اس جگہ جرمنی، اٹلی اور آسٹریا کے کیتھولک اور عیسائی گروہوں کی قسمت یا ان کے تباہی خیز کیریکٹر کے متعلق اشارہ کیا جا سکتا ہے

نہرو یہ بھی واضح کرتا ہے کہ تاریخی طور پر ہندو اور مسلمان باہم امن کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دیہات میں عام طور پر ابھی تک یہی خاکہ موجود ہے۔ فرقہ وارانہ فسادات دیہاتی نہیں بلکہ زیادہ تر شہری حادثہ ہیں۔ جب کبھی دیہات میں کسی قسم کی شورش برپا ہوئی ہے، تو یہ عموماً اقتصادی نوعیت کی ہوتی ہے۔ مسلمان کسان ہندو ساہوکار پر اور ہندو کسان مسلمان ساہوکار پر حملہ کرتے ہیں۔ مشہور موپلا شورش بالکل اقتصادی بنا پر تھی۔ بنگال میں کانگرسی وزارت بنانے میں ناکامی زیادہ حد تک اس وجہ سے تھی۔ کانگرس اپنی ترکیب میں زیادہ تر متوسط طبقہ یا اعلیٰ زمیندار طبقہ پر مشتمل تھی۔ اور وہ غریب مسلمانوں کی پروا نہیں کرتی تھی۔ لیکن جیسے نہرو نے اپنی کتاب "ہندوستان اور دُنیا" کے صفحہ ۱۸۷ پر لکھا ہے "ہندو اور مسلمان مختلف نسلیں نہیں ہیں۔ بلکہ وہ لازمی طور پر نسلوں کا واحد اجتماع ہیں" تعلیم و تربیت سے گہری تفریق پیدا ہو جاتی ہے۔ آج مسلمانوں کا گائے ذبح کرنا اور ہندوؤں کا مسجد کے سامنے باجا

بجا نا شورش کی قابلِ اعتماد وجوہات ہیں۔ سماجی زندگی میں کوئی ترقی پسند تبدیلی ہی ایسے جنون کا حل ہوسکتی ہے۔ کانگرس نے اعلان کر دیا ہے کہ اس کا اوّلین فرض اور بنیادی حکمت عملی ہندوستان کی اقلیتوں کے تمدّنی، لسانی اور مذہبی حقوق کا تحفظ ہے۔ تا کہ کسی ایسی تجویز سلطنت میں جو کانگرس کا مطمحِ نظر ہے۔ وہ ان کے نشو ونما اور یورپی طاقت کے ساتھ ملک کی تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی زندگی میں ان کی شراکت کیلئے ذرائع فراہم کرنے کی ضامن ہو۔ فرقہ دارانہ جھگڑے اور بھی ہیں۔ جنوب میں برہمن اور غیر برہمن کا سوال گرم رہا۔ اور ہندوستان میں ذات کے مقابلے میں غیر ذات کا مسئلہ بنیادی مسئلہ بنتا جا رہا ہے

اگر ہندو سوسائٹی نے موجودہ سرمایہ داری سے ساز باز کی اور پرانی روایات پر عمل کیا تو نتیجہ فسطائیت کی مؤثر شکل میں ظاہر ہوگا۔ پیدائش، روایت اور زمین کی ترگینی تہ فسطائیت کیلئے زمین تیار کرے گی جو ایک شدید درجاتی سوسائٹی کی طالب ہے۔

پروفیسر رادھا کرشن ہندومت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"ہماری قدیم تہذیب کو خیالی اور موجودہ تہذیب کو مادی خیال کرنا بغاوت کا عمل نہیں بلکہ ردِ عمل کا اظہار ہے۔ یہ ہماری قدامت پسندی کے مقابلے میں وسیع توجیہ ہے۔ بیماری اور افلاس کے متعلق کیا چیز خیالی ہوسکتی ہے اور ایسے نظام میں جو انسانوں کو بار برداری کے حیوانوں کا درجہ عطا کرتا ہے کیا روحانیت ہوسکتی ہے۔ انسانی دُکھ کو دور کرنے اور انسانی راحت کو بڑھانے کے لئے سائنس کے استعمال میں کسی قسم کی مادیت نہیں۔ مستقبل ان نوجوانوں کا ساتھ دیگا جو ایک خراب تمدنی نظام اور مذہبی جنون کے خلاف علم بغاوت بلند کرتے ہیں۔ اب جبکہ موقع نہایت غور طلب ہے۔ جو نوجوان اس سے بے پروا ہیں۔ بہت بھاری ظلم کے مرتکب ہیں۔ ناانصافی لوگوں

کی بے پروائی میں پرورش پاتی ہے۔ بُرا مالک، غیر منصفانہ قانون، فاسق راہنما، بددیانت معلم ترقی پاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جن میں احساس عدل ہے غفلت کی مرض میں مبتلا ہیں۔ اگر تم تصور میں اس جسمانی اور ذہنی عذاب کا جو نیم عریاں اور نیم مردہ آبادی پر نازل ہے اندازہ رکھتے ہو۔ تو تم بے پروا نہیں ہو سکتے"

بھگوت گیتا جو گاندھی کی دل پسند مقدس کتاب ہے۔ عدم تشدد کی تصدیق میں مشکل سے پیش کی جاتی ہے۔ اس کا پس منظر کوروکشیتر ہے جو ہندوستان کی جنگ ترائجن (TROJAN WAR) ہے اور جنگجو ارجن بھائیوں کے ساتھ ایسی خون آشام جنگ لڑنے سے گریز کرتا ہے۔ اسے دیوتا کرشن کی طرف سے جو رتھ بان کے بھیس میں ہوتا ہے۔ اس بنا پر ترغیب دی جاتی ہے کہ اسے نتائج پر غور کئے بغیر اپنی ذات کے فرائض کو پورا کرنا چاہیئے۔ جہاں تک گریز اور سکون تلاشی کے میلان کا تعلق ہے جو ہندوستانی خیال پر مستولی رہا ہے۔ یہ نہایت اہم ہے اور ان کے لئے بھی مفید ہے۔ جو ہمارے موجودہ نزاعات کے کوروکشیتر سے بچنے کیلئے مذہب کو ایک گوشۂ عافیت میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ لیکن اس میں تو زیادہ زور نسلی فرائض پر دیا گیا ہے۔ مسٹر راجگوپال آچاریہ نے ہندوستان کی نہایت ہی شاندار کتب قدیم میں سے ایک کی تفسیر لکھی ہے۔ لیکن سارا زور نسل اور دھرم کی اطاعت پر دیا گیا ہے۔ یہ چیز بھی قسطائیت کے مفاد کے لئے استعمال ہو سکتی ہے۔

ہندومت کی قوت یا زوال کا غلط اندازہ لگانا بددیانتی ہو گی۔ آج برہمن خود ذات پات کی قیود کے پابند ہیں۔ عموماً رکابی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو ہاتھ کی مزدوری سے جی چراتے ہیں۔ تہوار اور شادیوں پر غریب دیہاتیوں کے نذرانوں پر گذر اوقات کرتے ہیں۔ مذہبی گداگروں کی ابھی کثرت ہے اور عموماً یہ اوباش بیماری پھیلاتے ہیں۔ بے شمار دولت غیر مفید کاموں مثلاً مندر اور خانقاہیں برقرار رکھنے میں ضائع کی جاتی ہے۔ ہندوستانی مذہب میں نہایت شاندار شخصیتیں ہیں

اور یہ بھولنا نہیں چاہئیے کہ ہندو مت نے اس زمانے میں بھی پاکیزہ ترین روحیں پیدا کی ہیں۔ ان میں ٹیگور ایک درخشاں مثال ہے

ایک پادری نے ابھی ابھی "چرچ ٹائمز" میں اپنا اینگلو انڈین فرقہ کے ساتھ تعلق ظاہر کیا ہے۔ اپنے خط میں اس نے فرقہ مذکور کی وفاداری کا ذکر کیا اور مثال کے طور پر اس نے ریلوے ہڑتال کا حوالہ دیا جس میں اینگلو انڈین اور ہندوستانی عیسائیوں نے حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ اور اس طرح مالکوں کو ہڑتال ناکام بنانے کے قابل بنایا۔ لیکن تمام عیسائی ایسی غداری کو نیکی نہیں سمجھتے۔ یہ عیسائیوں کو ان کے ہم پیشہ لوگوں میں عزیز نہیں بنا سکتا۔ مہاراجہ آف ٹراونکور کے ایک وارث کی پیدائش پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے ایک رومن کیتھولک بشپ نے اپنی تقریر میں کہا:۔

"نئے شہزادے پر رحمت ایزد کی مناجات کرتے ہوئے میں تمہیں خدا اور بادشاہ کی اطاعت کا مستحکم رشتہ یاد کرانا چاہتا ہوں۔ زمین پر تمام اقتدار کا منبع خدا ہے۔ ہر حکمران اس کا نائب ہے۔ کیونکہ یہی خدا کا فیصلہ ہے۔ حکمران تمام اقتدار اس سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ جو خدا سے عشق رکھتے ہیں۔ انکو زمین پر اس کے نمائندے بادشاہ سے بھی محبت کرنی چاہئیے۔ بادشاہ سے محبت اور احترام بالآخر خدا تک جا پہنچتے ہیں وہ جو اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ خدا سے بگاڑ پیدا کرتے ہیں اور عیسائیت یہی کچھ ہمیں سکھاتی ہے۔ اب چند انقلابی تحریکوں مثلاً دہریت اور اشتراکیت نے جو انسانی روح اور سوسائٹی دونوں کو تباہ کرنے کے درپے ہیں۔ ہماری اجتماعی زندگی پر بھی اثر انداز ہونا شروع کر دیا ہے۔ وہ در اصل بادشاہ کے غدار ہیں۔ بغیر خدا کے کوئی اقتدار قائم نہیں۔ الحاد اور ملحدوں سے قطع تعلق کر لو اور پرہیزگاری اور اطاعت قابل فخر روایات کو زندہ رکھو"۔

ظاہر ہے کہ اس قابل پادری نے اپنے مذہبی صحیفوں کو نہیں پڑھا۔ پادری موصوف کا اپنے اصول کو چند شہزادوں کے ساتھ متعلق کرنا قدرے طنز آمیز ہے۔ انگریزی چرچ کے لاٹ پادری عیسائیوں

کو سول نافرمانی کی تحریک سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ کیونکہ حضرت یسوع مسیح نے کہا ہے "حاکم اعلیٰ کی اطاعت کرو"۔ یہ اپنی مقدس کتاب کے ناجائز استعمال کا نادر نمونہ ہے۔

اب ہندوستانی یورپ کے واقعات کی تیز رفتاری سے باخبر ہیں۔ وہ نصرانی بادشاہیت کی تردید ہسپانوی آئمہ دین کے ذریعہ فرانکو کی مسلح بغاوت کی برکت اور لیبے سینا میں اطالوی فعل شنیعہ کے سلسلہ میں اطالوی پادریوں کی حمایت کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ فلموں اور رسالوں میں مغربی زندگی کی تصاویر اہل ہند کو مغرب کے مذہب کے احترام کی طرف مائل نہیں کر سکتیں۔ وہ نام نہاد عیسائیوں کے اس عذر لنگ سے اثر پذیر نہیں ہوتے۔ وہ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد عیسائیت پر تحسین کہتے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر عیسائیت کی تاریخ اور انجیل کے انقلابی اجزا ہندوستان میں نمایاں نہیں ہو سکے۔

ایک دوسرے کی کمزوریوں سے کھیلنا ایک پرانا کھیل ہے۔ اور ہمیں ہندوستانی توہم پرستی کا عیسائی روشن خیالی سے مقابلہ کرنے کی کوشش سے احتراز کرنا چاہیئے۔ کسوٹی صرف یہ ہے "انکے پھلوں سے تم ان کو جان لوگے"۔ اور آج تمام مذاہب اسی ترازو میں آزمائے جا رہے ہیں۔ صرف وہی مذہب زندہ رہ سکتا ہے۔ جو اپنی زندگی کی پابندگی کا ثبوت دے۔ اور ایسے افراد پیدا کر دے جو بدلتی دُنیا کا مردانہ وار مقابلہ کر سکیں۔ اور جن کے اندرونی ذرائع ان کو نئے نظام کی تعمیر میں شریک ہونے کے قابل بنا سکیں۔

ہندوستان کو ہمیشہ بُردباری پر ناز رہا ہے۔ لیکن اس میں نقائص بھی ہیں۔ آج ناانصافی کے خلاف زبردست جنگ اور مظلوم کی حمایت کی ضرورت ہے۔ ہندو دھرم اور اسلام دونوں شاندار عناصر کے حامل ہیں۔ اور ان کو رائگاں نہیں کرنا چاہیئے۔ ان مذاہب نے آرٹ اور لٹریچر پیدا کیا۔ لاانتہا انواع اور بلند پایہ جاذبیت کی ایک قوم بنائی۔ ہندوستان اپنے خزانوں سے نئی اور پرانی چیزیں نکال رہا ہے۔ لیکن فیصلہ کن رویہ وہی ہے جو عوام کی ضروریات اور انسانی شخصیت کے بنیادی

سوال کی طرف ہوگا۔

مذہبی گروہ دوسرے سوشل علیحدگی پسندوں کی طرح محبت کی بجائے نفرت اور خوف کی بنیاد پر زندہ رہنے کی رغبت رکھتے ہیں۔ پروفیسر بردلیے نے اپنی کتاب "تقدیر انسان" میں ظاہر کیا ہے کہ مذہبی فرقے رواجی جھوٹ اور فصیح بیانی میں مبتلا ہونے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ "جب ایک جھوٹ سماجی نشان کا رنگ روپ بھر لیتا ہے تو اسے ہمیشہ اچھا سمجھا جاتا ہے"۔ اور ہندوستان میں دوسری جگہوں کی طرح یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ ڈاکٹر بردلیو آگے لکھتا ہے کہ ایسی سماجی غلط بیانیوں کا وجود صرف مذہبی گروہوں تک محدود نہیں۔ بلکہ سیاسی جماعتوں اور سائنٹیفک اور آرٹ کے حلقوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ گروہوں کے رواج افراد کی نیک نیتی کو ملوث کر سکتے۔ اور انکو اندھے تصدیق کنندہ بنا سکتے ہیں جو ذات واحد کیلئے بھی سچ ہے۔ وہی جماعت اور اقوام کے لئے بھی سچ ہے۔ انتیرا گت ایک لاجماعت سوسائٹی کے خواب دیکھتی۔ اور اس کے لئے کام کرتی ہے اور یہی سچے مذہب کا منتہائے مقصود ہے لیکن ایسے کام کے لئے ایک کوہ شکن قوت کی ضرورت ہے جو انفرادی اور اجتماعی انانیت کی زنجیروں کو توڑ ڈالے۔ اور صرف ایسا مذہب ہی ہندوستان میں کوئی مناسبت رکھ سکتا ہے۔ اور اس سے کم درجہ کوئی چیز محض تفریق پیدا کرے گی، اور فنا کر دی جائے گی۔